إِنۡ أُرِيۡدُ إِلَّا الۡإِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اکتوبر ۲۰۱۲ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۱۶، شمارہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۲ء/ ذیقعدہ و ذوالحجہ ۱۴۳۳ھ

مشمولات

O پاکستانیات

دجل وفریب کی دنیا (ملالہ کیس)	مدیر	۲
لاہور کا اسلامی منظر نامہ	ڈاکٹر انعام اللہ	۶

O دعوت و اصلاح

ایک بھی گولی چلائے بغیر ہم آج بھی مغرب کو فتح کر سکتے ہیں	ڈاکٹر محمد امین	۹

O اسلام اور معیشت

اصل مسئلہ معاشی ہے	مولانا فاروق القادری	۲۷

O اسلام اور مغرب

اسلامی حوالے سے مغربی سائنسی وٹیکنالوجی کی مخالفت	مدیر	۳۳

O اتحاد بین المسالک

اتحاد امت اور ملی یک جہتی ۔ کرنے کے اہم کام	عرفان احمد	۴۳

O وفیات

مولانا سعید احمد رائے پوریؒ اور ان کا مشن	پروفیسر شاہد رشید	۴۹

O تبصرہ کتب

سیکولرزم ۔ مباحث اور مغالطے	مدیر	۵۳

پاکستانیات

ڈاکٹر محمد امین

ملالہ کیس

دجل وفریب کی دنیا

ہم سکول طالبہ ملالہ یوسف زئی پر قاتلانہ حملے کی مذمت کرتے ہیں لیکن ملالہ پر حملے کے دوسرے دن ایک دینی مدرسے پر امریکی ڈرون نے حملہ کیا جس میں ۱۸ معصوم طلبہ مع استاد شہید ہو گئے۔ اس کی مذمت نہ ہماری سیاسی وعسکری قیادت نے کی ہے اور نہ یورپ وامریکا اور دنیا بھر کے میڈیا نے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سکول کی ایک طالبہ پر طالبان کا حملہ جرم ہے تو امریکیوں کا مدرسے کے طلبہ کو قتل کرنا کیوں جرم نہیں؟ اگر طالبہ (ملالہ) پر حملہ کرنے والے دہشت گرد ہیں تو طلبہ پر ڈرون حملہ کرنے والا امریکہ کیوں دہشت گرد نہیں؟ اور اگر طالبہ (ملالہ) پر حملہ کرنے والے طالبان قابل مذمت ہیں تو طلبہ پر ڈرون حملہ کرنے والا امریکا کیوں قابل مذمت نہیں؟

ملالہ حملے پر ساری دنیا کی ہمدردیاں اُمڈ پڑی ہیں۔ پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ سوئی ہوئی OIC بھی ملالہ سے ہمدردی کے لیے جاگ گئی ہے۔ امریکی صدر اوباما سے لے کر میڈم بش تک اور آسٹریلیا کی خاتون وزیر اعظم سے لے کر جنوبی افریقہ کے پادری تک ہر کوئی ملالہ کے لیے رطب اللسان اور اس کی صحت کے لیے فکر مند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب نے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے ہائی سکول کی ایک طالبہ کو اسلامی انتہا پسندی اور تعلیمی رجعت پسندی کے خلاف مغربی جمہوریت، تعلیم اور لبرلزم کی نمائندہ قرار دے کر اسے ایک بین الاقوامی درجے کی اہم شخصیت بنا دیا ہے تا کہ مستقبل میں بھی اس سے کام لیا جا سکے۔

یہودی اور امریکی پلاننگ اور اثر ورسوخ کے تحت ساری دنیا کے میڈیا کے لیے ملالہ کئی دن تک ٹاپ سٹوری رہی اور ہمارے اس میڈیا کو بھی، جو اپنی پالیسی لائن امریکہ اور بھارت سے لیتا ہے، کئی روز تک سوائے ملالہ کی سٹوری کے دن رات اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔

ملالہ کا غم بجا لیکن اس وقت یہ لوگ کہاں تھے جب عافیہ زندہ درگور کر دی گئی، جب جامعہ حفصہ کی بچیاں فاسفورس بموں سے بھون دی گئیں، جب بوسنیا میں ایک پلاننگ کے تحت ہزاروں مسلمان بوسنیائی لڑکیوں کو کیمپوں میں رکھ کر اس وقت تک ان کی آبروریزی کی گئی جب تک وہ

سر بوں سے حاملہ نہ ہوگئیں اوراس وقت یہ سب کہاں سوئے ہوئے تھے جب عراق اورافغانستان میں ہزاروں نہیں لاکھوں عورتیں بیوہ ہوئیں، بچیاں یتیم ہوئیں اور لاکھوں خواتین کی عصمت دری کی گئی۔ اس وقت یہ میڈیا کہاں تھا جب دجلہ وفرات کی وادیوں پر کارپٹ بمباری سے اورتورابورا کی غاروں میں آکسیجن چوسنے والے بموں سے لاکھوں بے گناہ مسلمان بے نام ونشان مارے گئے۔ ان کا نوحہ کون لکھے گا اوران کے لیے بَین کون کرے گا؟

ہم امریکہ سے کوئی مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ تو اسلام اور مسلمانوں کا واضح دشمن ہے اور'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے نام پر مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ چھیڑے ہوئے ہے۔ وہ تو خوش ہوگا اگر پاکستانی فوج قبائلی علاقوں میں مزید آپریشن کرے کہ مارنے والے بھی مسلمان، مرنے والے بھی مسلمان اور جنگ کا علاقہ بھی پاکستانی، اسے اورکیا چاہیے؟ ہمارا سوال اپنی عسکری اور سیاسی قیادت سے ہے کہ تم نے ۴۰ ہزار پاکستانی مروادیے، کھربوں کے معاشی نقصان سے پاکستان کی معیشت تباہ کردی اورلوگ دووقت کی روٹی کے محتاج ہو گئے۔ تمھیں کیا ملا؟ کرسی واقتدار اور چندلاکھ ڈالرز؟ کیا ملک خداداد پاکستان اوراس کے باسیوں کی، ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی اوراس کے لہلاتے کھیتوں اور گنگناتی ندیوں کی یہ قیمت تھوڑی نہیں؟

تم طالبان کو کچلنا چاہتے ہو؟ ضرور کچلو! لیکن کیا تمھیں عقل نہیں کہ یہ جعلی طالبان ہیں۔ اصلی طالبان وہ تھے جن کا مطالبہ تھا کہ پاکستان میں شریعت نافذ کرو، تب پاکستانیوں اوران کے علماء کی اکثریت ان کے اس مطالبے کی حامی تھی اور آج بھی ہے، لیکن جب انہوں نے حکمرانوں سے کہا کہ اگر تم شریعت نافذ نہ کروگے تو ہم بندوق کے زور پر کریں گے تو علماء اور دین دار پاکستانیوں نے ان کی حمایت نہیں کی۔ حکمرانوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ تم شریعت نافذ کیوں نہیں کر دیتے کہ ان کے غبارے سے ہوا نکل جائے اور سارے پاکستانی بھی خوش ہوجائیں☆۔ اگر وہ لڑکیوں کے سکول اس لیے جلاتے ہیں کہ تمہارا مغربی نظام تعلیم ان کی بیٹیوں کو دین سے دور کرتا ہے تو تم نظام تعلیم کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بدل کیوں نہیں دیتے؟ اگر وہ مغربی نظام عدل نہیں چاہتے تو تم انہیں اسلامی نظام عدل دے کیوں نہیں دیتے؟ (موجودہ عدالتوں کا نام بدل کر انہیں قاضی عدالتیں قرار دینے کا فراڈ نہیں)۔

☆ کون سی شریعت اور وہ کیسے نافذ ہوگی؟ اس کا تفصیلی جواب سارے مکاتب فکر کے علماء کے متفقہ پلیٹ فارم 'ملی مجلس شرعی' نے اپنی رپورٹ میں دے دیا ہے ملاحظہ ہو، البرہان کا شمارہ اکتوبر ۲۰۱۱ء جسے آن لائن www.safa.edu.pk/category/alburhan بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

تمہیں سمجھ ہونی چاہیے کہ جن طالبان نے ملالہ پر حملہ کیا ہے وہ اصلی والے طالبان نہیں یہ تو جعلی اور نقلی طالبان ہیں۔ یہ امریکی اور بھارتی ایجنٹ ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ ہر وہ کام کرتے ہیں جس سے امریکہ کا فائدہ ہو اور اسلام اور پاکستان کا نقصان ہو اور فوراً بی بی سی کو فون کر کے تسلیم بھی کر لیتے ہیں کہ یہ معرکہ انہوں نے سرانجام دیا ہے۔ ملالہ پر حملہ جنہوں نے بھی طالبان کے نام پر کیا وہ تمہیں قبائلیوں سے لڑانا چاہتے ہیں لہٰذا تم ان کے فریب میں کیوں آتے ہو؟ ہوش کی دوا کرو! دشمن کو پہچانو اور اس کا مقابلہ کرو۔ جو اپنے ناراض ہیں ان کے جائز مطالبے مان کر ان سے صلح کر لو اور پاکستان کو بچاؤ۔ الیس منکم رجل رشید؟

۲۔ سی آئی اے کے جس شہ دماغ نے طالبان کے نام پر ملالہ پر حملے کی منصوبہ بندی کی اس کی شیطانی فراست مستحق داد ہے کہ اس نے اس حملے سے سارے مقاصد حاصل کر لیے ۱۔ ملک میں جاری حرمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریک دب گئی۔ ۲۔ ڈرون حملوں کے خلاف دفاع پاکستان کونسل اور عمران خان کا واویلہ سرد پڑ گیا ۳۔ قوم کی نفرتوں کا رخ دہشت گرد امریکہ کی بجائے طالبان یعنی اسلامی انتہا پسندوں کی طرف ہو گیا۔ ۴۔ وزیرستان اور قبائلی علاقوں کا دہشت گردوں کا گڑھ ہونا ایک بار پھر ثابت ہو گیا اور امریکہ کو پاکستان کی عسکری و سیاسی قیادت پر دباؤ بڑھانے کا موقعہ میسر آ گیا کہ تم وزیرستان میں آپریشن کرو ورنہ ہم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ چنانچہ پاکستان کے سرکاری حلقوں میں سی آئی اے کے گماشتوں کے سربراہ رحمن ملک کی وزارت داخلہ کے حوالے سے اخبارات میں یہ خبر آ گئی ہے کہ وزیرستان میں اس کے تعاون سے امریکی فوج کے داخلے کے لیے ہوم ورک مکمل ہو چکا ہے۔

۳۔ اگر کوئی ذرا گہری نظر سے دیکھے تو وہ سمجھ جائے گا کہ عالم اسلام خصوصاً پاکستان میں اسلامی انتہا پسندی کو فروغ دینے والا امریکہ ہے کیونکہ اس سے وہ مندرجہ ذیل سٹریٹجک مفادات حاصل کر رہا ہے:

○ اس کی وجہ سے امریکہ کو مسلم ممالک میں مسلح مداخلت کا موقع ملتا ہے اور ڈرون حملوں کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بے پناہ سرمایہ کاری کی ہے۔ وہ اسلامی انتہا پسندوں کو کھلے دل سے ڈالر بھی دیتا ہے اور اسلحہ بھی بلکہ افغانستان کی طرف سے افرادی قوت کے ذریعے مدد بھی۔

○ وہ ان سے دہشت گردی کراتا ہے، پاکستانی فوج پر حملے ہوتے ہیں اور امن و امان کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ پاکستان کی عسکری اور سیاسی قیادت پر دباؤ ڈالتا ہے کہ وہ ان انتہا پسندوں کو کچلے کیونکہ یہ دہشت گرد افغانستان میں امریکی فوجیوں پر حملے کرتے ہیں اور پاکستان کی ایمانی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے کمزور قیادت یہ دباؤ مان لیتی ہے۔ اس طرح دونوں طرف سے مسلمان مرتے ہیں اور پاکستان سیاسی و معاشی لحاظ سے برباد اور کمزور ہوتا ہے۔

o امریکہ اپنے اس اگلے ہدف کے قریب آتا جا رہا ہے کہ پاکستان کی نیوکلیر ٹیکنالوجی کو تباہ کر دیا جائے اور پاکستان کے حصے بخرے کر دیے جائیں جس کے لیے فی الحال بلوچستان کے خطے کو چنا گیا ہے اور وقت آنے پر ترکش کے باقی تیر بھی سامنے آ جائیں گے۔

چنانچہ یہ بات طے ہے کہ پاکستانی طالبان کے نام پر کام کرنے والے لوگ امریکی ایجنٹ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افغان طالبان کئی بار ان سے اظہارِ برأت کر چکے ہیں۔ بلاشبہ کارکنوں کی سطح پر ان پاکستانی طالبان میں مخلص لوگ بھی ہوں گے جو پاکستان میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے اپنی سمجھ کے مطابق سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں لیکن یہ لوگ اپنی قیادت سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔

۴۔ یہ واضح کرنے کے بعد کہ پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اور طالبانائزیشن کو امریکہ پروان چڑھا رہا ہے، ہمیں یہ بھی ڈر ہے کہ اگلے مرحلے میں وہ اسے قبائلی علاقوں سے نیچے پنجاب کے میدانوں میں لا کر ملک میں خانہ جنگی کرا دے گا بلکہ اس کا آغاز ہو بھی چکا ہے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ امریکہ نے پاکستانی میڈیا میں بڑی سرمایہ کاری کر رکھی ہے اور ہمارے اکثر ٹی وی چینلز امریکی لے پر رقص کرتے ہیں چنانچہ میڈیا میں فحاشی وعریانی عروج پر ہے اور پاکستان کے دیندار مسلمان اس صورت حال سے تنگ اور بیزار ہیں بلکہ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ چنانچہ اخبارات میں آ چکا ہے کہ طالبان کی طرف سے میڈیا کے اداروں پر حملوں کا خطرہ ہے بلکہ بعض ناچنے گانے والیاں ماری بھی جا چکی ہیں۔ اس طرح امریکہ کھلے عام نہ صرف اعتدال پسند دیندار مسلمانوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیل رہا ہے بلکہ دوسری طرف اپنے ایجنٹوں کو مزید کھل کھیلنے کی ترغیب بھی دے رہا ہے چنانچہ ہمیں خدشہ ہے کہ یہ چیز اگر اسی طرح بڑھتی رہی تو وہ وقت دور نہیں جب امریکی طالبان اور بے دین امریکی ایجنٹوں میں سول وار شروع ہو جائے گی۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ ہماری عسکری اور سیاسی قیادت کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں اور اپنے معاشرے اور ملک کو امریکی سازشوں سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کی ایک متفقہ تعبیر پر قوم کو جمع اور متحرک کیا جائے، شریعت نافذ کی جائے اور امریکی چنگل سے نکلا جائے۔ اگر پاکستان کی عسکری وسیاسی قیادت نے اس صورت حال کا تدارک نہ کیا تو خدانخواستہ پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اور وہ بنیاد ہی نہ رہے گی جہاں وہ کرسی واقتدار کا چسکا پورا کر سکیں گے۔ خدا نہ کرے وہ وقت آئے لیکن اس سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری عسکری اور سیاسی قیادت اپنا راستہ بدلے۔ فراست، جرأت اور اتحاد سے کام لیے بغیر نہ ہم زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ دعائیں بھی ضروری ہیں اور وہ کرنی چاہئیں لیکن نظامِ فطرت یہی ہے کہ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

پاکستانیات　　ڈاکٹر انعام اللہ

چند افکارِ پریشاں

لاہور کا اسلامی منظر نامہ

دینی جماعتوں اور دانشوروں کے لیے لمحۂ فکریہ

لاہور میں ابلیسی قوتیں انتہائی منظم، متحد اور متحرک ہیں جب کہ اسلامی قوتیں غیر منظم اور غیر متحد ہونے کے ساتھ ساتھ انسیابیت (Strearmlining) کے تصور اور خواہش سے بے نیاز ہیں۔ تحریکوں کے لیے یہ دنیا دار العمل بھی ہے اور دار الجزاء بھی (جب کہ افراد کے لیے دار العمل ہے، دار الجزاء نہیں)۔ ابلیس تو چاہتا ہی یہ ہے کہ:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں
مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہمارا یقینی علانیہ دشمن ہمیں کینہ، بغض، حسد، تکبر اور ریا کاری کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے اور اس کے پیروکار دنیا پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے حق پرستوں کو منتشر رکھنے کے لیے چالیں چلتے رہتے ہیں۔ اس کا ادراک، احساس اور حل اسلامی دانشوروں کے ذمے ہے۔

لاہور میں راسخ العقیدہ حلقوں (camps) میں سرفہرست جماعت اسلامی ہے جب کہ اس سے منسلک سیاسی حلقے اس کے دست و بازو بنتے ہیں۔ ماضی میں جماعت سے علیحدہ ہونے والی تنظیم اسلامی منظم ہے لیکن ملکی سطح پر اس کی آواز نحیف و نزار ہے۔ اسی طرح تحریک اسلامی (تحریکِ فکرِ مودودی) تو حد درجہ کمزور ہے۔

سلفی فکر کی ''جماعۃ الدعوۃ'' سڑکوں پر اپنی قوت کبھی کبھار دکھاتی ہے لیکن بعض مخلصین ان سے فرائض پر سنتوں کو حاوی کرنے کا شکوہ کرتے ہیں۔ ایک نئی آواز ''ایقاظ'' کی ہے جس کا حلقۂ اثر محدود لیکن جاندار فکر کی وجہ سے مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ سلفیوں کے دیگر گروہ کتنی سیاسی قوت رکھتے ہیں اور کس

لادین سیاستدان کے سائے میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، آنے والے انتخابات میں اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔

ساتویں نمبر سے صرف نظر کرکے آگے بڑھنے والی بہت بڑی قوت تبلیغی جماعت کی ہے جو مسلمانوں میں دین کی طلب پیدا کرنے کے اہم ہدف پر کام کررہی ہے۔ سیاسی میدان میں کردار کے حوالے سے اس سے توقع رکھنا خام خیالی ہے۔ البتہ وہ صحیح العقیدہ ''اسلامی حکومت'' کو اپنے رضا کار دینے کے لیے ہمہ تن تیار ہے۔

دیوبندی مدارس میں جامعہ اشرفیہ اور جامعہ مدنیہ قابل ذکر ہیں اور ان کی مختلف اصلاحی خانقاہیں اپنے شیوخ کی سرکردگی میں ذاتی تزکیے پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں اور سیاسی سطح پر وہ 'امام مہدی' کا انتظار کررہے ہیں۔

بریلوی مکتب فکر میں 'غلو' کا پہلو زیادہ ہے البتہ محدود مدارس اور مخلصین دین کی سرفرازی کے لیے کوشاں ہیں۔ غیر تنظیمی بیسیوں ادارے اور سینکڑوں کی تعداد میں باصلاحیت افراد انفرادی طور پر اسلام کی ترقی کا کام آٹھ دس مرلوں پر محدود 'اکھاڑوں' میں بڑی جانفشانی سے سرانجام دے رہے ہیں۔

لاہور شہر کا دور سے مشاہدہ کرنے والا (اگر مصنوعی سیارے کی خلائی تصویر میسر ہو تو اس کے ساتھ) ان مجاہدوں کی تگ و دو کو کیسے دیکھے گا؟ آپ خود چشم تصور میں اس تصویر کو دیکھنے کی کوشش کریں کہ کیا یہ جانباز اپنی زندگی میں اپنی ان محنتوں کو نتیجہ خیز ہونے اور موجودہ منظر میں دین کو سرفراز ہوتے دیکھ سکتے ہیں؟

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

لاہور کے بے دین یا لادین سیاست دان اس تصویر کو دیکھ کر ضرور ہنستے ہوں گے۔ انہیں ضرور معلوم ہوگا کہ کس گروہ کو کس وقت، کس طرح گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔

....

ہم میں سے اکثر امام مہدی کے منتظر اور اس امن و آتشی کے دور کا انتظار کررہے ہیں جب مسلمان

باہم متحد و متفق ہوں گے۔ کیا آج کا اسلامی دانشور اور امام امت کو اور عوام کو وہ بنیادیں نہیں فراہم کر سکتا جو اتحاد کی بنیادیں امام مہدی فراہم کریں گے۔ کیا ہم مستقبل میں جھانک کر وہ ممکنہ بنیادیں اور وہ حکمت عملی، وہ ادراک اور وہ احساس آج فراہم نہیں کر سکتے؟

کہا جاتا ہے کہ اس تیزی سے بدلتے ہوئے دور میں اس کرۂ ارض کے وارث سیکھنے والے (طالب علم) ہوں گے اور جو 'سیکھے ہوئے' (عالم) ہوں گے وہ ایسی دنیا میں رہتے ہوں گے جس کا وجود باقی نہیں رہا۔

آیئے! آج طالب علم بنیں اور سیکھنے کی کوشش کریں کہ کون سے زاویے اور رویے ہمیں 'انتشار فکر' سے بچا کر 'وحدت فکر' کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ یہ ان دس پندرہ فیصد لوگوں کی بقا کا مسئلہ ہے جو اسلام کو اپنی زندگی و موت کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔

البرہان

ہم البرہان کے فاضل قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر انعام اللہ صاحب کے اٹھائے ہوئے سوال کا جواب دیں کہ ہم کس طرح اس امت کو، اس ملک کو اور اس شہر کو 'انتشار فکر' سے نکال کر 'وحدت فکر' کی طرف لا سکتے ہیں؟ مدیر

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِ اعانت سالانہ 400 روپے　　تاحیات 5000 روپے

نام.................................... پتہ....................................

فون....................................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

دعوت و اصلاح

ڈاکٹر محمد امین

ایک بھی گولی چلائے بغیر ہم آج بھی مغرب کو فتح کر سکتے ہیں

ہم جو کہہ رہے ہیں نہ اس میں جذباتیت اور مبالغے کو کوئی دخل ہے اور نہ یہ خوش عقیدگی اور خوش فہمی پر مبنی کوئی دعویٰ ہے بلکہ ہم جو کہہ رہے ہیں وہ ایک انتہائی سنجیدہ بات ہے اور نہایت متوازن، فطری، عقلی، منطقی، سائنٹفک اور نپا تلا (well calculated) موقف ہے۔

ہمارے پاس طاقت موجود ہے

سیدھی سی بات ہے فتح وہی پاتا ہے جس کے پاس قوت و طاقت ہو اور ہمارے پاس قوت و طاقت موجود ہے اور وہ طاقت ہے نظریے کی۔ اگر ہم کہتے کہ مسلمان مغرب پر جنگ کے میدان میں غلبہ پا سکتے ہیں یا معاشی حوالے سے غالب آ سکتے ہیں یا سیاسی میدان میں غلبہ پا سکتے ہیں تو آپ ہمیں جھٹلا سکتے تھے کیونکہ مغرب واقعتاً فوجی لحاظ سے ہم سے بہت آگے ہے، اسے معاشی لحاظ سے بھی ہم پر برتری حاصل ہے اور سیاسی لحاظ سے بھی وہ ہم پر غالب ہے لہٰذا ہم ہرگز نہیں کہتے کہ مسلمان ان شعبوں میں مغرب پر غلبہ پا سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ ہم نظریے کی جنگ میں مغرب پر غلبہ پا سکتے ہیں تو آپ ہماری سچائی کو چیلنج نہیں کر سکتے کیونکہ مسلمان واقعی اس شعبے میں اہل مغرب پر بالا دست ہیں کیونکہ ان کے پاس اہل مغرب سے زیادہ طاقتور نظریۂ حیات موجود ہے۔ ہم جو کہہ رہے ہیں اس کے درج ذیل تین قوی شواہد ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا:

اول: اس نظریے کی ماہیت اور خصوصیات

دوم: یہ نظریہ ریاستی قوت کے بغیر محض اپنی داخلی قوت سے غلبہ پا سکتا ہے۔

سوم: مغرب اپنے غلبے اور قوت و حشمت کے باوجود آج بھی اسلام کی قوت نفوذ سے خائف اور ہراساں ہے اور اس کا راستہ روکنے کے لیے سارے ممکنہ حربے آزما رہا ہے۔ ان تینوں شواہد کی وضاحت درج ذیل ہے۔

i۔ اسلامی نظریے کی ماہیت اور خصوصیات

اس نظریے کی بہت سی خصوصیات ایسی ہیں جنہوں نے اسے انسانی تاریخ میں منفرد مقام اور ناقابل مزاحمت قوت تسخیر عطا کی ہے جن میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ بنیادی مآخذ کی موجودگی

یہ دنیا کا واحد اور جدید ترین (latest) مذہب ہے جس کے بنیادی مآخذ محفوظ و مامون ہیں۔ یہ دعویٰ کوئی دوسرا مذہب نہیں کرسکتا اور کرے تو ثابت نہیں کرسکتا سوائے اسلام کے۔ اس کا بنیادی ماخذ قرآن حکیم ہے جس کا اصلی (original) ہونا عملی تواتر سے ثابت ہے اور ایک نسل کے کروڑوں لوگ اسے دوسری نسل کو بجنسہٖ منتقل کرتے رہے ہیں اور پچھلی ساری صدیوں کے تحریری نسخے بھی موجود ہیں جن میں اور موجودہ قرآن میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے علاوہ یہ حفظ کے ذریعے بھی تواتر سے منتقل ہوتا آرہا ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اپنے اندر معجزانہ تاثیر رکھتا ہے اور دنیا میں آج بھی جو لوگ مسلمان ہورہے ہیں ان کی اکثریت قرآن حکیم کا مطالعہ کر کے مسلمان ہورہی ہے۔ جو اس کو پڑھتا ہے وہ اس کا ہوجاتا ہے۔

اسلام کا دوسرا مآخذ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت اور تعلیمات کا محفوظ رہنا ہے اور یہ کام ایسے منفرد تحقیقی اسلوب سے محفوظ ہوا ہے کہ آج کے مغربی محققین بھی اس کی تعریف وتوصیف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ اس کا مواد آج بھی قابل تصدیق (verifiable) ہے اور فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال اور روایت و درایتکے عمل کی وجہ سے قابل اعتماد ہے اور عہد جدید میں مسلمان ہونے والوں کا ایک بڑا طبقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ اور تعلیمات سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرتا ہے۔

۲۔ زندہ معاشرہ اس کا شاہد ہے

اسلامی معاشرے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں انقطاع واقع نہیں ہوا اور پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک اسلام پھیلا ہی ہے سکڑا نہیں ہے سوائے اندلس کی ایک مثال کے جہاں عیسائیوں نے ظلم و جبر کی انتہا کرتے ہوئے مسلمانوں کا نام ونشان وہاں سے مٹاڈالا۔ مسلمان آج دنیا میں اس لیے کمزور اور ذلیل وخوار ہیں کہ انہوں نے اپنے دین پر عمل چھوڑ دیا ہے لیکن اس کے باوجود مسلم معاشرے میں آج بھی بعض ایسی خوبیاں موجود ہیں جن میں مغرب کی 'مہذب' دنیا ان سے بہت پیچھے ہے مثلاً ان کا خاندانی

نظام۔راقم جب ۱۹۸۴ء میں برٹش کامن لاء کے مطالعے پر مبنی ایک کورس کے سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی گیا تو وہاں ایک دن کلاس میں مغرب کے خاندانی نظام کی تباہی خصوصاً طلاق کی کثرت کا موضوع زیر بحث آ گیا۔ یورپ کے مختلف ملکوں میں اس وقت طلاق کی شرح ۵۰٪ کے لگ بھگ تھی۔ میں پاکستان بلکہ مسلم دنیا سے وہاں واحد طالب علم تھا۔ برطانوی پروفیسر نے مجھ سے پوچھا کہ پاکستان میں طلاق کی شرح کیا ہے؟ میں نے کہا 'میرے پاس مصدقہ اعداد وشمار نہیں ہیں لیکن پاکستان میں طلاق کی شرح بہرحال ۱٪ سے کم ہے۔اس پر استاد صاحب سمیت سارے طلبہ وطالبات حیران و پریشان رہ گئے اور راقم سے اس کا سبب پوچھنے لگے کہ جب پاکستان میں شرح تعلیم کم ہونے کی وجہ سے لوگ ان پڑھ ہیں، غریب بھی ہیں اور 'غیر مہذب' بھی اور طلاق دینا آسان بھی ہے کہ زبان سے تین لفظ نکالے اور طلاق واقع ہوگئی۔تو پھر اس کا استعمال اتنا کم کیوں ہے؟ میں نے کہا، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون میں اللہ اور رسولؐ کے نزدیک طلاق بری چیز ہے لہٰذا اسلام اس کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور مسلم معاشرہ چونکہ صدیوں سے قائم ہے اس لیے طلاق نہ دینے کی روایت یہاں مستحکم ہوگئی ہے اور مسلم معاشرتی اقدار کا مضبوط حصہ بن چکی ہے بلکہ یوں کہیے کہ وراثتاً مسلمانوں کے خون میں شامل ہوگئی ہے لہٰذا ایک ان پڑھ مسلمان بھی جانتا ہے کہ بیوی کو طلاق نہیں دینی کیونکہ مذہب اور معاشرہ اس کو معیوب سمجھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے مغربی لوگ اس گئے گزرے دور میں بھی مسلمانوں کے معاشرتی اخلاق واقدار سے متاثر ہوکر اسلام قبول کر لیتے ہیں جن میں محمد اسد (لیو پولڈ ویسن) جیسے بڑے لوگ بھی شامل ہیں۔

۳۔ اسلام ایک فطری، منطقی، سائنسی، عقلی اور مدلل دین ہے

اسلام ایک فطری، منطقی، سائنسی، اور مدلل دین ہے جو عقلی معیار اور تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔اس کی تعلیمات انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں اور قرآن حکیم کا مستقبل اسلوب یہ ہے کہ وہ جب بھی کوئی دعویٰ کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی حمایت میں ایسے دلائل دیتا ہے جو برہان قاطع کی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان کو لاجواب کر دینے والے ہوتے ہیں۔اب اتفاق دیکھیے کہ مغرب کی تہذیب بنیادی طور پر ایک عقلی تہذیب ہے (کیونکہ وحی کے انکار کے بعد عقل ہی اس کی علمی اساس ہے) لہٰذا مغرب کے جو لوگ بھی تعصب سے بالاتر ہوکر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں اسلامی تعلیمات مغلوب کر لیتی ہیں کیونکہ وہ ہر لحاظ سے عقل و دلیل کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور مغرب کے عقلی اور سائنٹفک ذہن کو اپیل کرتی ہیں۔

۴۔اسلام روحانی پیاس بجھاتا ہے

مغرب کی تہذیب اپنی اصل میں مادہ پرست ہے اور اس کے پیشِ نظر صرف دنیا اور اس کی آسائشیں ہیں لیکن دوسری طرف اللہ نے انسان کی فطرت میں اپنی پیاس رکھی ہے جسے انسان شعوری طور پر محسوس کرے یا نہ کرے، یہ بہرحال اس کی فطرت وجبلت کا ایک بنیادی جزو ہے لہٰذا اس سے محرومی انسان کے اندر ایک خلا پیدا کرتی ہے جس نے مغربی انسان کو قلبی سکون واطمینان اور حقیقی خوشی سے محروم کر رکھا ہے اور اس کے اندر ایک روحانی خلاء پیدا ہوگیا ہے۔ یہ روحانی خلاء مغرب میں عام ہے اور اسلام اس کا شافی، فطری اور حقیقی علاج مہیا کرتا ہے لہٰذا مغرب کے بہت سے افراد اس روحانی پیاس کی وجہ سے سکون واطمینانِ قلبی کی تلاش میں جب اسلام کے چشمۂ صافی تک پہنچتے ہیں تو ان کی روح اس سے سیراب ہوکر حقیقی خوشی واطمینان محسوس کرتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے جو لکھا ہے کہ اسلام اہلِ یورپ میں دماغ کے راستے نہیں دل کے راستے اتر سکتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے۔

۵۔اسلام کی جامعیت

سیکولرازم کا نظریہ درحقیقت غیر فطری ہے اور خود عقل کی میزان پر بھی پورا نہیں اترتا کیونکہ اگر ہم مانیں کہ خدا ہے اور وہ خالق ورازق، علیم وخبیر، مہیمن ومقتدر اور ہادی ورہنما ہے (جیسا کہ الہامی کتب ہمیں بتاتی ہیں کہ وہ ان صفات سے متصف ہے) تو پھر کوئی وجہ نہیں اور اس کی کوئی دلیل نہیں کہ ہم اس اللہ کی ایک بات تو مانیں لیکن دوسری نہ مانیں یعنی ذاتی زندگی میں تو ہم اس خدا کی اطاعت کریں لیکن اجتماعی زندگی میں اس کی بات ماننے سے انکار کردیں۔لہٰذا ایک سلیم الفطرت مغربی شخص جب اسلام کی جامعیت دیکھتا ہے کہ وہ ساری زندگی کے لیے رہنمائی دیتا ہے تو اسے یہ بات قرینِ عقلِ سلیم لگتی ہے اور اسلام کی جامعیت اسے متاثر کرتی ہے خصوصاً اسلام کی بعض معاشرتی اور اخلاقی تعلیمات جو مسلم معاشرے ابھی تک محفوظ رکھے ہوئے ہیں، ان کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ افسوس کہ مسلمان اسلام کی سیاسی، معاشی، تعلیمی اور قانونی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور انہوں نے ان شعبوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرکے انہیں میکرو اور مائکرو لیول پر باقاعدہ ایک قابلِ عمل نظام کی صورت نہیں دی اور اس وقت پوری دنیا میں کوئی ایک بھی مسلم مملکت ایسی نہیں جہاں یہ نظام روبہ عمل ہوں، ورنہ اگر یہ ہوجائے اور ایک حقیقی مسلم ریاست وجود میں آجائے تو یقین کیجیے کہ مغربی معاشرے اس کی پیروی پر مجبور ہوجائیں گے۔

ii- ریاستی قوت کے بغیر اسلامی نظریے کی قوت نفوذ

اسلام کی مندرجہ بالا خصوصیات کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی خوبیوں اور قوت کی بناء پر پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداء میں (صحابہ کرامؓ کے عہد میں) اسے ریاستی قوت حاصل تھی، جب روم وایران کی تہذیبوں کو اسلامی سپاہ نے زیروزبر کر دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر کبھی بھی کسی کو جبراً مسلمان بنانا نہیں رہا بلکہ جہاد نے صرف مخالف قوتوں کے زور کو توڑا اور نظریہ اپنی خوبیوں اور داخلی قوت کے زور سے پھیلا۔ بعض اہل مغرب کا یہ الزام کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے محض اتہام اور جھوٹا پروپیگنڈا ہے جس کی اصل وجہ مسلمانوں کے خلاف ان کا تعصب ہے۔ بلکہ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اسلام نے کئی مواقع پر مخالف نظریات، تہذیبوں اور قوتوں کو اپنی خوبیوں اور داخلی قوت سے شکست دی ہے جب کہ ریاستی قوت اس کی پشت پناہ نہ تھی۔ ہم اختصار کی خاطر صرف تین مثالیں پیش کرتے ہیں۔

اولاً: تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں یونانی فکر کا حملہ بڑا شدید تھا یہاں تک کہ بعض علماء کے علاوہ اس دور کی مسلم حکومت بھی اس کی ہمنوا ہوگئی تھی لیکن تب کے مسلم سکالرز نے اس کا زور توڑ دیا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے صبر سے، امام اشعریؒ اور ماتریدیؒ نے اسلوب مفاہمت سے اور امام غزالیؒ نے قوت استدلال سے اس کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے اور ان اکثر کوششوں میں ریاست ان کی مؤید نہ تھی لیکن اسلام کی فکری اور نظریاتی قوت نے اپنے غلبے کا راستہ خود بنا لیا۔

ثانیاً: منگولیا کے صحراؤں سے اٹھنے والی چنگیزی آندھی نے مسلم دنیا کو تاراج کر دیا اور اس کی فوجی قوت نے آسائش پسند مسلم دنیا کو تہہ و بالا کر ڈالا اور خلافت عباسیہ کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی لیکن ریاستی اور فوجی قوت کے انہدام کے باوجود اسلامی نظریے نے محض اپنی داخلی قوت سے ان فاتحین کو ایک صدی کے اندر اندر مفتوح بنا دیا اور وہی منگول (مغل) اسلام کے خادم بن کر ابھرے اور صدیوں اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کا سبب بنتے رہے خصوصاً ہندوستان میں ان کا کردار (اپنی کمزوریوں کے باوجود) منفرد اور تاریخی ہے جہاں معمولی اقلیت ہونے کے باوجود انہوں نے ہندو اکثریت پر طویل مدت حکمرانی کی اور اسلامی غلبے کا سبب بنے۔

ثالثاً: مشرق بعید میں کسی مسلم ریاست اور حکمران نے حملہ نہیں کیا لیکن آج انڈونیشیا عالم اسلام کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک ہے۔ مسلم تاجروں اور صوفیاء نے اسلامی نظریے کی داخلی قوت سے اسلام کو ان علاقوں کا اکثریتی مذہب بنا دیا بلکہ انڈونیشیا کے ساتھ ملائیشیا، مالدیپ، برونائی، برما،

سری لنکا، فلپین اور پاک وہند کے ساحلی علاقے کو بھی شامل کرلیں تو اس علاقے کی آبادی آدھی اسلامی دنیا کے برابر بن جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی نظریہ اپنی اشاعت ونفوذ کے لیے اسلامی ریاست کا محتاج نہیں ہے۔

بلکہ یہاں یہ لطیف نکتہ بھی یادرہے کہ اسلامی تہذیب کی یہ ایک منفرد خصوصیت ہے کہ اسلامی معاشرے نے نہ صرف اسلامی ریاست سے باہر اشاعت اسلام کا کام خود سنبھالا بلکہ داخلی طور پر بھی کئی اہم ترین شعبے جیسے تعلیم، قانون، دعوت واصلاح وغیرہ کبھی ریاست کے سپرد نہیں کیے بلکہ معاشرے نے یہ اپنے ہاتھ میں رکھے اور انہیں کامیابی سے چلایا اور ان کے لیے کبھی ریاستی قوت پر انحصار نہیں کیا۔

iii۔مغرب اسلام سے خوفزدہ ہے

اس امر کے باوجود کہ مغرب دنیا پر عموماً اور عالم اسلام پر خصوصاً مادی لحاظ سے ہر طرح کی سیاسی، معاشی، تعلیمی، قانونی اور فوجی بالادستی رکھتا ہے، اس کے باوجود وہ اسلام سے خوف زدہ ہے اور اسلاموفوبیا میں مبتلا ہے۔ اس خوفزدگی کے چند مظاہر یہ ہیں:

۔ مغرب کا مذہبی اور سیاسی طبقہ شروع ہی سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرتا اور تعصّبات پھیلاتا رہا ہے۔ اس پراپیگنڈے بلکہ خرافات کا اندازہ کرنے کے لیے اگر آپ صرف انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لائیڈن کے مضمون 'محمد' [صلی اللہ علیہ وسلم] کا مطالعہ کرلیں تو آپ حیران و پریشان اور دہشت زدہ ہوجائیں گے مثلاً ان کے نزدیک (نعوذ باللہ) قرآن (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصنیف ہے اور اسلام عیسائیت کا چربہ ہے (کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیرہ نامی عیسائی راہب سے استفادہ کیا تھا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نفسیاتی مریض تھے اور انہیں مرگی کے دورے پڑتے تھے، وہ جنسی جنونی تھے، مسلمان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بت کی پوجا کرتے ہیں ۔وغیرہ وغیرہ (نقل کفر کفر نہ باشد) ۔آج کل عیسائی انتہا پسندوں کے ساتھ یہودی اور صہیونی بھی شامل ہوگئے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف تعصّبات پھیلانے اور جھوٹا پروپیگنڈا کرنے کا کام دوآتشہ ہوگیا ہے اور ان کو بنیاد پرست، انتہا پسند، دہشت گرد، جنونی، وحشی اور پتہ نہیں کیا کیا کہا جارہا ہے۔

۔ مغرب میں اسلامی مآخذ، اقدار اور شعائر کے خلاف ایک زبردست مہم چلائی جارہی ہے۔ پچھلی صدی میں مستشرقین تحقیق اور علم کے نام پر ذخیرۂ احادیث کو مشکوک ٹھہرانے کی جدوجہد کرتے رہے

ہیں اور آج کل قرآن حکیم کو غیر موثر کرنے اور اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے ایک جعلی قرآن بنا کر دنیا بھر میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے مرجع عقیدت اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کارٹون بنا کر نیٹ اور اخبارات میں چھاپے جا رہے ہیں اور آپ کی کردار کشی کے لیے کتابیں لکھی اور فلمیں بنائی جا رہی ہیں۔ قرآن حکیم کو دہشت گردی کا ذمہ دار ٹھہرا کر امریکی پادری بار بار قرآن کو جلانے کا ڈرامہ کرتے ہیں۔ فرانس اور ہالینڈ میں مسلمان عورتوں کے سر ڈھانپنے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں مساجد کے مینار بنانے کے خلاف قانون بنایا گیا ہے۔ برطانیہ میں مسلمان عورتوں کے نقاب پہننے پر ان کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ جرمنی میں ایک مسلمان خاتون کو سر ڈھانپنے کے جرم میں عدالت کے اندر قتل کر دیا گیا۔

- امریکہ میں ۹/۱۱ کے واقعے کے بارے میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے مغربی محققین بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ امریکی سی آئی اے اور اسرائیلی موساد کا کارنامہ تھا اور اس کے دو بڑے مقاصد تھے ایک یہ کہ امریکہ اور یورپ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اسلام کے پھیلاؤ کو روکا جائے اور اہل مغرب کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مشتعل کر دیا جائے اور دوسرے جن مسلمان ممالک میں اسلامی اقدار جڑ پکڑ رہی ہیں، شریعت نافذ کی جا رہی ہے اور وہ فوجی یا معاشی لحاظ سے مضبوط ہو رہے ہیں، ان کو قوت سے کچل دیا جائے تا کہ دنیا کے سامنے اسلام کا کوئی عملی نمونہ نہ آ سکے چنانچہ افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، عراق اور لیبیا کو تاراج کیا گیا اور آج کل پاکستان اور شام پر حملے ہو رہے ہیں۔

ان سارے اقدامات کا مقصد یہ ہے کہ مغرب میں اسلام کو پھیلنے سے روکا جائے، وہاں کے عوام کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت بھر دی جائے تا کہ وہ اسلام کو ہمدردانہ نگاہ سے نہ دیکھ سکیں اور معروضی طور پر اسلام کا مطالعہ نہ کر سکیں اور اس سے متاثر نہ ہو سکیں۔

لیکن ان سارے اقدامات کے باوجود:

- خود امریکی حکمران اور تھنک ٹینک تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا ہے۔

- امریکہ، فرانس، جرمنی اور بہت سارے یورپی ممالک میں اسلام اس وقت عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے۔ (گو اکثر اسلام کی اس حیثیت کا رسمی طور پر اقرار نہیں کیا جاتا)۔

۔ مغرب کے انتہائی ذہین اور نمایاں افراد اسلام قبول کر رہے ہیں مثلاً نیٹو کے سابق جنرل سیکرٹری مراد ہوف مین، سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی سالی محترمہ بلیئر، برطانوی صحافی آیان ریڈلے، پاپ سنگرز میں سے برطانیہ کا یوسف اسلام اور امریکی......................

اور یورپ و امریکہ میں اسلام کی قبولیت کی تیز رفتاری کا یہ عالم اس کے باوجود ہے کہ:

۔ دنیا کے ۵۷ مسلم ممالک میں سے کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جس نے مغرب میں اشاعت اسلام کے لیے کوئی بڑی تنظیم یا ادارہ قائم کیا ہو یا اس کے لیے بھاری بجٹ مختص کیا ہو اور نہ مسلم امہ کی سطح پر کوئی بڑا دعوتی ادارہ موجود ہے جو مغرب میں اشاعت اسلام کے لیے بھرپور منصوبہ بندی اور بڑے فنڈز کے ساتھ وہاں دعوتی کام کر رہا ہو (ماسوائے تبلیغی جماعت، رابطہ عالم اسلامی کے شعبہ مساجد اور اکا دکا دوسری کوششوں کے)۔

۔ مغربی ممالک میں جانے والے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت وہاں کے ماحول میں جا کر انہی کے رنگ میں رنگی جاتی ہے اور وہ اسلام کے حق میں کوئی کام نہیں کرتی۔

۔ مغرب میں تعمیر ہونے والی مساجد اور اسلامک سنٹرز چلانے کے لیے جو علماء کرام خصوصاً برصغیر سے وہاں جاتے ہیں وہ اسلام کی بجائے وہاں اپنے مسلک کی تبلیغ کرتے ہیں اور ان میں سے بہت کم اس معیار کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ مقامی باشندوں کو اعلیٰ علمی سطح پر، ان کی زبان میں اور ان کے ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے اور ان میں گھل مل کر اسلام پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں بلکہ وہ تو بمشکل وہاں موجود مسلمانوں کی نماز اور بعض دینی سماجی رسوم جیسے نکاح، طلاق، جنازہ وغیرہ ادا کرنے کا کام کرتے ہیں۔ نیز مغرب میں مساجد اور اسلامک سنٹرز قائم کرنے اور چلانے والوں کو بہت سی مشکلات، تکالیف اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۔ مسلمانوں کی اکثریت وہاں اچھے اخلاق و کردار کا مظاہرہ نہیں کرتی کہ مقامی لوگ ان کی عمدہ سیرت اور پاکیزہ کردار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کریں۔

۔ اکثر مسلم ممالک کو اپنی پڑی ہے، ان کے ہاں نہ سیاسی استحکام ہے نہ معاشی فارغ البالی اور ان کے ہاں اتنے مسائل ہیں کہ وہ ان سے نکل کر اور ان سے اوپر اُٹھ کر مغرب میں اشاعت اسلام کا سوچ ہی نہیں سکتے۔

۔ مسلم حکمرانوں، دانشوروں، مفکروں، ادیبوں، صحافیوں، اور تعلیمی ماہرین وغیرہ کی موثر تعداد نہ صرف مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب ہے بلکہ اس کی ذہنی غلام ہے اور مغرب کی پیروی ہی کو ترقی و کمال کا

واحد ذریعہ اور موزوں راستہ تصور کرتی ہے۔

ان سارے منفی عوامل کے باوجود اسلام مغرب میں اپنی داخلی قوت کی بنیاد پر تیزی سے پھیل رہا ہے۔

حکمت عملی اور طریق کار

سوال یہ ہے کہ اگر ہم محض اپنے نظریے کی قوت کی بناء پر مغرب کو فتح کرنا چاہیں، جیسا کہ ہم نے ماضی میں کئی دفعہ کیا ہے، تو اس کے تقاضے کیا ہیں، اس کے لیے کیا حکمت عملی اور طریق کار اختیار کیا جائے اور کیا اقدامات کیے جائیں؟ اس سلسلے میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

مغرب میں موثر دعوت کے تقاضے

۱۔ فکری استقلال

ہماری رائے میں اولیں چیز جو ہمیں درکار ہے وہ فکری استقلال ہے۔ مطلب یہ کہ ہمیں مغربی فکر وتہذیب کی چکا چوند سے مرعوب و متاثر نہیں ہونا، اس کو واحد ذریعۂ ترقی نہیں سمجھنا، اس کی عظمت کے گن نہیں گانے، اس کی پیروی کی خواہش نہیں رکھنی اور مِن جملہ یہ کہ مغرب کی ذہنی غلامی سے نکلنا ہے اور یہی نہیں بلکہ خود کو اور دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ اسلام جیسے متوازن، جامع، مدلل، فطری، منطقی اور سائنسی دین کے مقابلے میں یہ ایک ناقص اور فساد انگیز تہذیب ہے جو مذہب کو رد کرتی ہے، اللہ اور آخرت کا انکار کرتی ہے، استعماریت کی علم بردار ہے اور دوسری تہذیبوں اور قوموں کو گھٹیا سمجھتی اور ان کا استحصال کرتی ہے۔ اس تہذیب کے علمبردار ممالک نے ماضی میں بھی غیر مغربی اور خصوصاً مسلم ممالک کا سیاسی اور معاشی استحصال کیا، ان کے وسائل لوٹے اور آج بھی امریکہ و یورپ یہی کر رہے ہیں اور تیسری دنیا کے خام مال اور انرجی کے ذرائع استعمال کر کے انہیں غریب تر بنا رہے ہیں اور اپنی دنیا حسین تر بنا رہے ہیں۔ مغربی تہذیب نے انسانی معاشرت کا بیڑہ غرق کر دیا ہے اور عورت کو مادر پدر آزادی دے کر خاندانی نظام کو تباہ کر دیا ہے اور فوجی برتری کے زعم میں مہلک ترین ہتھیار تیار کیے ہیں جن سے ساری دنیا چند منٹوں میں تباہ ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس مادہ پرست تہذیب نے زمین کو فساد سے بھر دیا ہے اور یہ اسی قابل ہے کہ اسے اٹھا کر تاریخ کے کوڑہ دان میں پھینک دیا جائے، نہ کہ اس سے مرعوب ہو کر اس کی پیروی کی جائے۔

۲۔نظریے کی قوت وعظمت پر یقین

اور یہی کافی نہیں بلکہ ہمیں اسلام کی عظمت و برتری پر، اس کی خوبیوں پر، آج کی دنیا میں اس کے قابل عمل ہونے پر اور اس کے سارے انسانی مسائل حل کر سکنے کی صلاحیت پر بھر پور یقین ہونا چاہیے۔ایسا یقین جس سے نہ صرف ہم مطمئن ہوں بلکہ ہم اسلام کی ان خوبیوں کے علمبردار بن جائیں ۔ ہم میں اتنا اعتماد ہو کہ ہم اسلام کی ان خوبیوں کے بارے میں دلائل و براہین سے دوسروں کو بھی مطمئن (convince) کر سکیں اور انہیں باور کرا سکیں کہ اسلام انہیں روحانی سکون بخش سکتا ہے، دنیا میں ان کو خوشی، اطمینان اور ایک مقصد حیات دے سکتا ہے اور آخرت کی نعمتوں کا سزاوار بنا سکتا ہے۔

جب تک ہمیں یقین نہ ہو کہ اسلام عظیم تر ہے، مفید تر ہے اور یہ روشنی ہے اور ماسوا اسلام جو کچھ بھی ہے، وہ اندھیرا ہے، وہ گمراہی ہے، وہ نہ دنیا میں سکون دے سکتا ہے اور نہ آخرت سنوار سکتا ہے، اس وقت تک ہم اسلام کی دعوت کا حق ادا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔

۳۔دعوت پہنچانے کا جذبہ

فکری استقلال اور اپنے نظریے کی برتری کا یقین رکھنے کے بعد مغرب میں کامیاب دعوتی سرگرمیوں کے لیے جو چیز درکار ہے وہ یہ کہ ہر مسلمان میں دعوت پہنچانے کا شدید جذبہ ہونا چاہیے اور اس جذبے کا محرک مخاطبین کی خیر خواہی ہونا چاہیے کہ یہ حضرت آدمؑ کی اولاد ہونے کے ناطے ہمارے بھائی ہیں اور ہمیں ان بھائیوں کو جہنم کی آگ سے بچانا ہے۔ پھر یہ بات بھی ہر مسلمان کے علم میں ہے کہ امت مسلمہ امت دعوت ہے یعنی دعوت پہنچانا اس کا فرض منصبی ہے کیوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے لہٰذا اب قیامت تک کے انسانوں تک دین حق کی دعوت پہنچانا مسلم امہ کی منصبی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے امت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہم میں سے ہر آدمی اپنی ذاتی حیثیت میں ذمہ دار اور جواب دہ ہے کیونکہ دعوت و انذار گو فرض کفایہ ہے لیکن جب تک سب انسانوں تک موثر انداز میں اسلام کی دعوت نہ پہنچ جائے اس وقت تک یہ ذمہ داری ہر مسلمان پر ذاتی طور پر فرض عین کی طرح عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کے ابلاغ کا حق ادا کرے۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جب تک دعوت پہنچانے کا شدید جذبہ ایک مسلمان میں نہ ہو وہ اس راہ میں ایثار و قربانی سے کام نہیں لے سکتا اور اس راہ میں آنے والی مشکلات و تکالیف خندہ پیشانی سے برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس جذبے کے تحت ہر مسلمان کو اس راہ میں اپنا مال بھی صرف

کرنا چاہیے، اپنے اوقات اور صلاحیتیں بھی لگانی چاہئیں اور پیش آمدہ مشکلات کا صبر اور حوصلے سے مقابلہ بھی کرنا چاہیے۔

۴۔نمونۂ عمل بننا

دعوت کو کامیاب بنانے کا ایک بنیادی تقاضا یہ بھی ہے کہ مخاطبین کے سامنے اس دعوت پر عمل کا ایک ماڈل موجود ہو کیونکہ دعوت کے لیے اگر کتاب کافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انبیاء مبعوث نہ فرماتے لیکن لوگوں کو اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی یہ نفسیاتی احتیاج ہوتی ہے کہ وہ دعوت قبول کرنے سے پہلے اس دعوت کو داعی کی صورت میں مجسم دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ ان کو یقین آ جائے کہ دعوت سچی اور قابل عمل ہے لہٰذا مغرب میں دعوتی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ جو افراد وہاں دعوت پہنچائیں ان کی سیرت پاکیزہ ہو، ان کا کردار اجلا ہو اور وہ مجسم اسلام ہوں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ عالم اسلام میں کم از کم ایک معاشرہ اور ریاست تو ایسی ہو جو اسلامی تعلیمات کا جیتا جاگتا نمونہ ہو تا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ اسلام فرد اور معاشرے میں جو تبدیلی لانا چاہتا ہے، جب وہ آ جائے تو کیسی ہوتی ہے!

طریق کار

مغرب میں موثر طریقے سے دعوتی کام کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اسالیب اختیار کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ موزوں افراد کار کی تیاری

مسلم معاشرے کو ایسے افراد تیار کرنے کی ضرورت ہے جو اہل مغرب سے ان کی زبان میں بات کر سکیں جو ان کے ماحول، تہذیب، کلچر اور مائنڈ سیٹ کو سمجھتے ہوں اور ان کی ذہنی اور فکری سطح کے مطابق ان سے ڈائیلاگ کر سکیں۔

اگر ہم پاکستانی معاشرے کے تناظر میں دیکھیں تو ہمارے دینی مدارس جو علماء تیار کرتے ہیں وہ مغرب میں دعوتی کام کرنے کے لیے بالکل غیر موزوں ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہماری جن یونیورسٹیوں میں شعبہ ہائے اسلامیات قائم ہیں، وہ بھی ایسے افراد کم ہی تیار کر پاتی ہیں جو مغرب میں موثر دعوتی کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ۱۹۹۴ء میں جب ہم بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈیمی

میں پڑھاتے تھے، ہم نے اس وقت وہاں دعوۃ اکیڈیمی کے ڈائریکٹر جنرل صاحب کولکھ کر تجویز دی کہ دعوۃ اکیڈیمی کے شعبۂ دعوت میں باقاعدہ ڈگری کورسز کا اجراء کیا جائے اور اعلیٰ علمی سطح پر دعاۃ کی تیاری کا کام شروع کیا جائے۔ موصوف نے اتنی نوازش کی کہ ہماری تجاویز پر ہماری موجودگی میں ایک نظر ڈالی اور غور کا وعدہ فرماتے ہوئے کاغذ دراز میں ڈال دیا جہاں سے وہ کبھی باہر نہیں نکلا☆۔

مطلب کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی عالمی سطح کے مسلم ادارے (مثلاً او آئی سی، رابطہ عالم اسلامی، مؤتمر عالم اسلامی وغیرہ)، کسی مسلم حکومت یا کسی اسلامی یونیورسٹی (جامعۃ الازہر، جامعہ مدینہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ملائیشیا و اسلام آباد یا کسی دوسری یونیورسٹی) یا کسی اسلامی جماعت (جیسے الاخوان المسلمون، جماعت اسلامی، ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی یا ترکی کی فتح اللہ گولن کی تحریک......) کو توفیق دے تو کرنے کا کام یہ ہے کہ دعوہ سٹڈی سنٹر، مرکز مطالعۂ مغرب (Occidental Study Center) یا ادیان وتہذیبوں کے تقابلی مطالعے کے انسٹی ٹیوٹ قائم کر کے وہاں ایسے افراد تیار کیے جائیں جو اعلیٰ درجے کی علمی، فکری اور ابلاغی صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ وہ پروفیسر ہوں، محقق ہوں، دانش ور ہوں، صحافی ہوں، جو مغرب کی زبانیں جانتے ہوں، ان کے مائنڈ سیٹ کو سمجھتے ہوں اور مختلف ادیان اور تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ کر چکے ہوں وہ مشنری جذبے سے وہاں جائیں اور عمریں وہیں گزار دیں۔ اس طرح کے لوگ مسلسل تیار ہو کر نکلتے رہیں اور ایک ایک مغربی ملک میں جا کر ڈیرے ڈالتے رہیں تو پھر بات بننے کا رستہ کھلے گا۔ غالباً نبیؐ کے آخری خطبے کو سن کر بعض صحابہؓ نے اُسی وقت گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دنیا کے دور ترین علاقوں میں جا کر ڈیرے ڈال دیئے۔ ثبوت کے طور پر آج بھی بعض صحابہ کرامؓ کی قبور بعض ایسے دور دراز علاقوں میں ملتی ہیں۔

۲۔ دعوت کے مختلف رنگوں میں امتیاز

دعوت کے کام کو تعمیم (generalization)، مکینیکل اور سٹیریو ٹائپ ہونے سے بچانے کے لیے مغربی معاشرے کے مختلف اجزاء (ments seg) کے لیے دعوتی حکمت عملی الگ ہونی چاہیے۔ ہماری رائے میں مغربی معاشرے میں انسانوں کے تین بڑے ٹائپ ہو سکتے ہیں:

۱۔ علمی ۲۔ عوامی ۳۔ روحانی

☆ دعوت اکیڈیمی غالباً اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے جو پاکستان میں کام کر رہا ہے۔ یہ عام طور پر شارٹ کورسز کا

اہتمام کرتا ہے اور کبھی بھلے زمانے میں اس نے عالمی سطح پر بھی کچھ سرگرمیوں کی ابتداء کی تھی جواب غالباً خوف فسادِ مغرب اور بجٹ کے محدود ہونے کی وجہ سے محروم التفات ہیں۔

علمی حلقوں میں کام کرنے کے لیے اعلیٰ علمی وفکری صلاحیتیں رکھنے والے افراد کی ضرورت ہے جو مغرب کے علمی وتحقیقی معیار کے لحاظ سے اگر ان سے برتر نہ ہوں تو کم بھی نہ ہوں۔عوامی حلقوں میں کام کرنے کے لیے ایک الگ طرح کی نفسیات کی ضرورت ہے اور وہاں کے لوگوں کی روحانی پیاس بجھانے کے لیے کچھ دوسری طرح کے افراد درکار ہیں جن کی تیاری کا کام مسلم معاشرے کو کرنا ہے۔

۳۔ اشاعت لٹریچر

مسلم مصنفین کا تیار کردہ اکثر دینی لٹریچر مسلمانوں کے لیے مفید ہوتا ہے اور انہی کے مائنڈ سیٹ کے مطابق تیار کیا جاتا ہے لہٰذا یہ غیر مسلموں کے لیے مفید نہیں ہوتا۔ضرورت اس امر کی ہے کہ غیر مسلموں کے لیے خصوصی طور پر ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو انہیں صحیح پس منظر اور اسلوب میں اسلام کا تعارف کروائے ، ان کے شکوک وشبہات، اعتراضات اور ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کا شافی جواب دے۔اس لٹریچر کی زبان بہت عمدہ اور معیاری ہونی چاہیے۔اس کی طباعت کا معیار بھی ہرگز مغربی معاشرے کے معیار طباعت سے فروتر نہیں ہونا چاہیے ورنہ یہ لٹریچر اپنی وقعت کھودے گا اور فائدے کی بجائے الٹا نقصان دہ ہوگا۔

۴۔ الیکٹرانک میڈیا

اس وقت مغرب میں بسنے والے مسلمان الیکٹرانک میڈیا سے جو تھوڑا بہت بلکہ انتہائی قلیل استفادہ کر پاتے ہیں، وہ مسلمانوں کے لیے ہوتا ہے۔یہی حال مسلم معاشروں میں الیکٹرانک میڈیا کا ہے کہ وہ مقامی لوگوں کو ہی مخاطب کرتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب میں الیکٹرانک میڈیا کے شعبے میں کام کرنا جیسے اپنا ٹی وی سٹیشن قائم کرنا یا معیاری پروگرام تیار کر کے چلانا اور انٹرنیٹ اور دیگر سمعی وبصری ذرائع استعمال کرنا بہت مہنگا ہے لیکن اگر عالم اسلام ہوش میں آئے اور اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، اسے فکری استقلال اور داعیانہ جذبہ میسر آجائے تو مسلم حکومتوں اور سرمایہ داروں کے پاس مادی وسائل کی کمی نہیں ہے۔

۵۔ پرنٹ میڈیا

پرنٹ میڈیا کا مسئلہ بھی وہی ہے جو ہم نے اوپر اشاعت لٹریچر اور الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے ذکر کیا ہے یعنی مواد (content) کا علمی وفکری لحاظ سے برتر اور ظاہری (form کے) لحاظ سے معیاری ہونا، سمت کا درست ہونا اور مغرب میں اس کی موثر اشاعت کے وسائل مہیا ہونا......وغیرہ

۶۔ تعلیمی اداروں اور ہوسٹلوں کا قیام

آپ ذرا غور کیجیے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پیر کیسے جمائے؟ تجارت کے نام پر، غریبوں کے لیے ہسپتال اور رفاہی ادارے قائم کر کے اور مغربی طرز کے تعلیمی ادارے قائم کر کے۔ کیا ہمارے لیے اس میں کوئی سبق نہیں ہے؟ اگر ہمیں فکری استقلال اور داعیانہ جذبہ میسر آ جائے تو کیا مسلمان حکومتیں اور سرمایہ دار مغرب میں تجارت کے حوالے سے موثر کردار ادا نہیں کر سکتے؟ کیا مسلمان وہاں تعلیمی ادارے قائم نہیں کر سکتے؟ نہیں، ہم مسلمان بچوں کے لیے اسلامی سکولوں کی بات نہیں کر رہے بلکہ امریکی و یورپی بچوں کے لیے سکولوں کی بات کر رہے ہیں جہاں ہماری پالیسی وہی ہو جو لارڈ میکالے نے ہم ہندوستانیوں کے لیے وضع کی تھی۔ اور ہم تو ابھی مسلمانوں کو مثبت باتوں کی طرف متوجہ کر رہے ہیں ورنہ انگریزوں نے جو طریقے اختیار کیے تھے مثلاً مقامی قوتوں کو آپس میں لڑانا، تجارتی مراعات کے لیے رشوتیں دینا، سازشوں سے مسلم حکمرانوں کے فوجی سرداروں اور وزیروں کو خریدنا...... وغیرہ پر کیا 'الحرب خدعه' کی حدیث کا اطلاق نہیں ہوسکتا؟

۷۔ حلیفوں کی تلاش

مسلمان داعی اگر فراست سے کام لیں تو مغربی معاشرے میں ایسے لوگ اور طبقات موجود ہیں جن کا تعاون وہ حاصل کر سکتے ہیں مثلاً مغرب میں ایسے مذہبی طبقات موجود ہیں جو مغربی تہذیب اور فکر کی مذہب دشمنی سے نالاں ہیں اور ہیومنزم، سیکولرازم، ریفارمیشن اور جدیدیت و روشن خیالی کے نام پر عیسائیت کی پسپائی اور اسے کونے میں دھکیلے جانے پر رنجیدہ و ناخوش ہیں اور مسلمان حکمت و فراست سے کام لے کر اس طبقے کے ساتھ مفاہمت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مغرب میں بائیں بازو کا رجحان رکھنے والے لاکھوں لوگ موجود ہیں جو مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہیں اور خود مغرب میں ایسی حکومتیں بھی موجود ہیں جو ظالمانہ امریکی و یورپی پالیسیوں سے تنگ ہیں اور ان سے نفرت کرتی ہیں ان سے ''دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے'' کے اصول پر تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پس چہ بائد کرد

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ پہلا قدم اٹھانا ہی مشکل ہوتا ہے۔ گاڑی اگر دھکے سے بھی سٹارٹ ہو تو ایک دفعہ سٹارٹ ہونے کے بعد پھر وہ چلتی رہتی ہے (بشرطیکہ اس میں فیول ہو اور اس کے پرزے صحیح کام کر رہے ہوں)۔ اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ مغرب میں دعوتی سرگرمیوں کے اس موضوع پر سوچنے والا

کوئی نہیں، کوئی ادارہ موجود نہیں جو پہلا قدم اُٹھائے۔ ہم کہتے ہیں کہ عالم اسلام کی کوئی یونیورسٹی یا علمی ادارہ اس موضوع پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس منعقد کرے اور اس میں ایسے مسلم سکالرز کو مدعو کرے جو فکری استقلال کے ساتھ اس موضوع پر سوچنے کا حوصلہ اور جذبہ رکھتے ہوں۔ یہ کانفرنس مغرب میں دعوتی کام کو منظم کرنے کی منصوبہ بندی کرے اور اس کے لیے عالم اسلام کی سطح پر ایک ایسا ادارہ قائم کرے جو اس موضوع پر مستقل کام کرتا رہے۔ اگر ایک کانفرنس سے یہ مقصد حاصل نہ ہو تو مناسب وقفے سے دوسری اور تیسری کانفرنس بھی منعقد کی جاسکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ کانفرنس بلانا کوئی مقصد نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور اصل مقصد یہ ہے کہ مادی اور افرادی وسائل جمع کیے جائیں اور ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا جائے جو چلتا رہے اور مغرب میں دعوت کے موضوع پر تحقیق و تدریس، افراد کار کی تیاری، منصوبہ بندی اور کام کی عملی نگرانی کا فریضہ سرانجام دیتا رہے۔

دیوانے کی بڑ

یہ افغان جہاد کے آخری زمانے کی بات ہے۔ پاکستان ائیر فورس کے ایک ریٹائرڈ ائیر کموڈور ہمیں ملے اور گفتگو کے دوران کہنے لگے کہ اگر پاکستان ائیر فورس مجھے ایک سکواڈرن دے دے تو میں اس جنگ کا پانسا پلٹ دوں گا۔ ہم نے حیران ہو کر کہا 'وہ کیسے؟' کہنے لگے کہ میں یہ سکواڈرن لے کر ماسکو پر حملہ کر دوں گا۔ میں نے کہا کوئی بچ کر آئے گا؟ کہنے لگے 'نہیں' اور یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اسلام اور امت کے مفاد کے لیے چند افراد اگر جان کی قربانی دے دیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ ہم نے کہا لیکن اس سے ہوگا کیا؟ وہ کہنے لگے تم فوجی آدمی نہیں ہو، اس لیے سمجھ نہیں سکتے۔ پاکستانی سکواڈرن کا ماسکو پر حملہ اتنا بڑا واقعہ ہوگا اور اس سے روس کا مورال اتنا ڈاؤن ہوگا اور مجاہدین کا مورال اتنا بلند ہو جائے گا کہ روس کی شکست کا راستہ کھل جائے گا۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ سوچنا کہ ہم بغیر گولی چلائے اپنے نظریے کی قوت کی بنیاد پر مغرب پر فتح پاسکتے ہیں اور اس کے لیے منصوبہ بندی کرنا، ادارے قائم کرنا اور جدوجہد کرنا خود ایک انقلابی بات ہے اور اس کے دوررس اثرات ہوں گے۔ اس وقت مسلم ذہن فکری لحاظ سے پسپائی اور دفاعی مائنڈ سیٹ (defeatish and defensive mindset) رکھتا ہے۔ ہمارا یہ اقدام اسے فکری سطح پر ہجومی مائنڈ سیٹ (offensive mindset) میں تبدیل کر دے گا اور یہ بہت بڑی تبدیلی کا مظہر ہوگا۔ اصل چیز ہی فکر ہے اور اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ ہے کہ ہم مغرب کی ذہنی غلامی سے نکل نہیں پا رہے اور اس کا حل اقبال کے لفظوں میں یہی ہے کہ ''لڑا دے ممولے کو شہباز سے'' اور ممولے کا

شہباز کو چیلنج کرنا اور اس کے مقابلے پر اتر آنا ہی اس کی فتح ہے، بعد میں جو ہوگا سو ہوگا۔

ہم نے اپنی کتاب 'مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اسباب اور لائحۂ عمل' میں مسلمانوں کو موجودہ زوال سے نکلنے اور عظمت گم گشتہ کی بازیافت کا لائحہ عمل دیا ہے اور اس کتاب کے آغاز میں اس اعتراض کا کہ آج جب کہ مسلمان ملت کمزور ونا تواں ہے اور خوار وزبوں ہے، زوال کے قعر مذلت میں گری ہوئی ہے اور اسے اپنی جان اور بقاء کے لالے پڑے ہوئے ہیں، مسلم نشأۃ ثانیہ کی بات کرنا دیوانے کی بڑ نہیں تو اور کیا ہے؟ کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آگے بڑھنے کی سوچ کا فطری اور مناسب وقت وہی ہوتا ہے جب آپ دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہوں۔ لہٰذا مسلم عروج اور غلبے کی بات کرنا اور اس کے لیے سوچنا آج ہی موزوں ہے نہ کہ کل، جب ہم اس مصیبت سے نکل چکے ہوں گے۔ لہٰذا کوئی فرزانہ راقم کی اس تجویز پر کہ ہم مغرب کو دعوت سے فتح کر سکتے ہیں، دیوانے کی بڑ کی پھبتی نہ کسے کیونکہ نفسیات کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی کام آپ نے ایک دفعہ کیا ہو تو آپ اسے دوسری دفعہ بھی کر سکتے ہیں۔ ہم نے اگر یونان کے فکری حملے کا منہ موڑا تھا، ہم نے اگر مسلم معاشرے کو فتح کرنے والے چنگیزیوں کو مسلمان کر کے ان کو مغلوب کر لیا تھا، اگر ہم نے دعوت سے انڈونیشیا اور ملائیشیا جیسے کروڑوں کی آبادی والے خطے کو فتح کر لیا تھا اور خود برصغیر میں ہم نے معمولی اقلیت ہوتے ہوئے سیکڑوں برس اکثریت پر حکومت کی تھی تو آج ہم کیوں مغرب کو دعوتی لحاظ سے فتح نہیں کر سکتے؟ ہم یقیناً کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں اپنے نظریے کی طاقت کا احساس ہو، اس کی صداقت وصلاحیت پر ہمارا گہرا ایمان ہو اور ہمیں یقین ہو کہ ماسوا اسلام سب گمراہی اور فساد فی الارض ہے اور امت وسط ہونے کے ناطے ہمارا فرض منصبی ہے کہ انسانیت کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچائیں اور اس کے لیے فراست سے کام لیتے ہوئے دعوت کے میدان میں محنت کریں۔

اس فکر پر چند اعتراضات اور ان کے جوابات

سوال: مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی بالکل واضح ہے۔ قرآن وسنت اس کے شاہد ہیں۔ خود عصر حاضر میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ امریکہ ویورپ نے کس طرح عراق اور افغانستان کو اپنی مہیب جنگی مشینری سے تباہ وبرباد کیا۔ پھر لیبیا کی باری آئی اور آج کل پاکستان وشام پر حملے جاری ہیں۔ ان حالات میں کہ جہاد بمعنی قتال مسلم امہ پر فرض ہو چکا ہے آپ لوگوں کو قیل وقال کی دعوت دے رہے ہیں کیا یہ جہاد سے جان چھڑانے یا اسے نظر انداز کرنے کی دعوت تو نہیں؟

جواب: مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی سے ہم انکار نہیں کرتے اور ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان ملک پر کفار حملہ کردیں تو اس کا دفاع کرنا واجب ہے اور جہاد ہے......لیکن اس کے باوجود ہم آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے کہ مسلمان (جیسے کیسے بھی وہ ہیں) اس وقت دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی (اور بعض لوگوں کے نزدیک ایک تہائی) ہیں۔ مسلم امہ اس وقت ایمانی، اخلاقی، سیاسی اور فوجی لحاظ سے جتنی کمزور ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتی ہے کہ مغرب کو ظلم وستم سے باز رکھ سکے اور اپنا دفاع کرسکے، جیسا کہ افغانستان میں طالبان نے کیا ہے کہ وہاں گوریلا جنگ سے امریکہ اور یورپ کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ یا یورپ اس ہزیمت کے بعد مسلمان ہوجائے گا اور اسلام قبول کرلے گا؟ نہیں! بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کی نفرت اور اشتعال مزید بڑھے گا۔ لہٰذا مغرب کا اسلام کی طرف آنے کا کوئی امکان نہ ہوگا۔ چنانچہ جہاد کی اہمیت وضرورت اور اس کے ثمرات اپنی جگہ لیکن ایک فرض ادا کرنے کا یہ مطلب کب ہے کہ دوسرے فرائض سے منہ موڑ لیا جائے۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے اس وقت ۵۷ ممالک ہیں اور آبادی دو ارب کے قریب ہے، کیا ضروری ہے کہ یہ سب ممالک اور یہ ساری آبادی ایک ہی طرح کی حکمت عملی اپنائے۔ ایک مسلمان ملک میں جہاد فرض عین ہوسکتا ہے جب کہ دوسرے مسلمانوں اور ملکوں کے لیے وہ فرض کفایہ ہوگا۔ لہٰذا اگر ہم فراست اور حکمت عملی سے کام لیں تو دعوت وجہاد کی دونوں پالیسیاں بیک وقت روبہ عمل لائی جاسکتی ہیں۔ عالم اسلام کے کچھ لوگ اگر ایک جگہ جہاد میں مصروف ہوں تو دوسری جگہوں کے لوگ دعوت میں مشغول کیوں نہیں ہوسکتے؟ لہٰذا ہمارے نزدیک یہ دونوں کام موزوں حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے بیک وقت سرانجام دیے جاسکتے ہیں۔

سوال: مغرب علم وتحقیق، سیاست ومعیشت اور سائنس وٹیکنالوجی میں اتنا آگے جاچکا ہے اور مسلمان ان شعبوں میں اتنے پیچھے ہیں کہ اہل مغرب کے مسلمانوں سے متاثر ہونے کے امکانات معدوم ہیں بلکہ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اخلاق میں بھی وہ ہم مسلمانوں سے آگے ہیں اور اہل کتاب ہونے کے باوجود اسلامی تعلیمات پر عمل وہ کررہے ہیں جب کہ ہم نے اسلامی تعلیمات سے منہ موڑا ہوا ہے۔ جب ہمارا کردار یہ ہے تو اہل مغرب ہماری دعوتی سرگرمیوں سے کیوں کر متاثر ہوں گے؟

جواب: آپ کے سوال کا جواب ہماری تحریر میں موجود ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیاوی لحاظ سے اکثر شعبوں میں مغرب عالم اسلام سے آگے ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے، جسے بعض منصف مزاج مغربی دانشور بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مغرب بعض میدانوں میں ناکام ہوا ہے جیسے وہاں کی معاشرتی

زندگی۔ پھر دین سے دوری نے وہاں ایک روحانی خلا پیدا کیا ہے اور لوگ مادی خوشحالی کے باوجود سکون و اطمینان سے محروم ہیں جس کا مظہر وہاں نفسیاتی ہسپتالوں اور پاگل خانوں کی کثرت اور خودکشی کا رجحان ہے۔ پھر ظلم وستم کا جو بازار مغربی حکومتوں نے مسلم دنیا کے مختلف حصوں میں گرم کر رکھا ہے، اگرچہ وہ اس کے بہت سے 'معصومانہ' جواز پیش کرتے ہیں اور جھوٹے پروپیگنڈے سے عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگ اس سے خوش نہیں ہیں اور وہ تبدیلی چاہتے ہیں۔ جن سعید روحوں کی پیاس بہت بڑھ جاتی ہے وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسلام کے چشمۂ صافی تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اتنا ہی کرسکیں کہ مناسب انداز میں ان تک اسلام کی دعوت پہنچا دیں تاکہ انہیں ایک متبادل نظر آ جائے تو پھر بھی بات بن سکتی ہے۔

اسی طرح آپ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اگرچہ مسلمانوں میں بہت سی کمزوریاں ہیں، مادی بھی اور اخلاقی بھی لیکن اگر ہم غیر جانبدار ہو کر سوچیں تو بعض پہلوؤں میں ہم اہل مغرب سے آج بھی آگے ہیں جیسے مثلاً ہمارا معاشرتی نظام ان سے آج بھی بہتر ہے۔ قرآن جیسا زندہ معجزہ ہمارے پاس موجود ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند سیرت اور تعلیمات بھی۔ اور ہمارا تاریخی تجربہ یہ ہے کہ مسلم ریاست کے ناکام ہو جانے کے باوجود مسلم معاشرہ اپنی نظریاتی قوت کی وجہ سے آگے بڑھتا اور پھیلتا ہی رہا ہے اور آج بھی بہت سی کمزوریوں کے باوجود مغرب میں بھی پھیل رہا ہے لہٰذا ہمارا یہ کہنا بے وزن نہیں کہ اگر ہم شعوری طور پر فکری استقلال اور جذبۂ صادقہ سے کام لیں اور کار دعوت میں اپنی توانائیاں حکمت وفراست سے صرف کریں تو ہم مغرب کو بہت کچھ دے سکتے ہیں جن میں سرفہرست ہمارا نظریۂ حیات ہے جو فطرت، عقل اور دلیل کے ہر معیار پر پورا اترتا ہے جب کہ مغرب کے پاس ایسی کوئی چیز موجود نہیں۔

معلومات داخلہ برائے سعودی یونیورسٹی

وہ حضرات جنہوں نے پچھلے پانچ سالوں میں ایف اے یا اس کے مساوی، یا کسی دینی مدرسے سے العالیہ کی سند حاصل کی ہو اور ان کی عمر ۲۳ سال سے زائد نہ ہو، یا پچھلے پانچ سالوں میں بی اے کی سند حاصل کی ہو اور عمر ۳۰ سال سے زائد نہ ہو۔

رابطہ:

پروفیسر ڈاکٹر رانا خالد مدنی (فاضل مدینہ یونیورسٹی، پی ایچ ڈی) سابق مترجم مواجہ شریفہ، مسجد نبوی، مدینہ منورہ، چیئرمین ادارہ اشاعت اسلام لاہور۔ رابطہ: ۰۳۰۶-۴۴۷۶۰۵۵

اسلام اور معیشت		مولانا محمد فاروق القادری

اصل مسئلہ معاشی ہے

یہ مضمون مولانا محمد فاروق قادری صاحب کی کتاب 'اصل مسئلہ معاشی ہے' کی تقدیم پر مشتمل ہے جسے ہم معمولی تہذیب کے بعد قارئین البرہان کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔ بظاہر روایتی دینی فکر کو اس میں ایک نوع کا مبالغہ اور تجاوز نظر آئے گا لیکن اس چیز سے انکار ممکن نہیں کہ معاشی مسئلہ انسان کے بنیادی ترین اور اہم ترین مسائل میں سے ہے اور یہ کہ ہمارے مغرب پرست حکمران تو رہے ایک طرف ہمارے علماء اور دینی عناصر نے بھی اس زندہ مسئلے کو اسلامی تناظر میں کما حقہ سمجھنے، سمجھانے اور سلجھانے کے لیے کوئی تگ ودو نہیں کی اور جن لوگوں نے کچھ کوشش کی وہ یا تو منبع کفر وضلالت سرمایہ داری نظام کی زلف گرہ گیر سے نہ بچ سکے اور اس کے چربے سے 'اسلامی بنکاری نظام' اور 'تکافل' جیسی سوغات ہی پیش کرسکے یا دوسری جانب کمیونزم اور سوشلزم کی طرف لڑھک گئے۔ یہ چیلنج علمی بھی ہے اور عملی بھی اور ہم پوری سنجیدگی سے یہ بات کہتے ہیں کہ اگر مسلم علماء وسکالرز آج کے معاشی مسئلے کا حل صحیح اسلامی تناظر میں پیش کریں اور ہمارے حکمران اسے نافذ کرکے اس کے انقلابی نتائج عملاً دنیا کے سامنے پیش کردیں تو نہ صرف مسلم معاشرے سے افلاس ختم ہوجائے گا بلکہ مغرب کیا پوری دنیا اسلام اور مسلمانوں کے قدموں میں آ گرے گی لیکن ہم خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں اور نماز روزے اور نکاح وطلاق کے مسائل پر بحث اور عمل کرکے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اسلام کا حق ادا کردیا ہے۔ مدیر

متعدد نظریات، افکار اور مذاہب نے سادہ اور بے زبان عام آدمی کو بے روزگاری، بھوک، افلاس، ظلم، ناانصافی اور بالادست طبقے سے بچانے کے لیے بڑے بڑے دلکش پروگرام پیش کیے مگر عملی طور پر نتیجہ صفر رہا۔ یہاں تک کہ اسلام ایسے سادہ، غریب پرور اور انقلابی مذہب کا انسانی مسائل کے بارے میں جدید ترین منشور بھی تیس سال کے بعد لپیٹ دیا گیا اور اسے صرف دینی عبادات ومعمولات کی ادائیگی تک محدود کردیا گیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مفکر اسلام شاہ ولی اللہ کو "فکّ کل نظام" یعنی 'اقتصادی اور معاشی اعتبار سے فاسد نظام کو اکھاڑ پھینکا جائے' کا نعرہ دینا پڑا اور علامہ اقبال پکار اٹھے ؎

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

سارے مسئلے کو سوچنے، سمجھنے، کوٹنے، چھاننے اور کھنگالنے کے بعد مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو چیز مسلمانانِ عالم بالخصوص اہلِ پاکستان کو مسلسل پیچھے دھکیل رہی ہے، وہ ان پر مسلط ظالمانہ معاشی نظام، انتہائی سنگدلانہ اقتصادی طرزِ حیات، آمرانہ اندازِ حکمرانی، اسلام کی غلط تعبیر و توضیح، بیشتر مذہبی قائدین کے قول و فعل میں فرق، عزیمت کی بجائے مسلسل ان کا رخصت پر عمل پیرا ہونا، اور تبلیغ و ارشاد اور اصلاح کی بجائے سیاست کی دلدل میں اترنا ہے۔

جاگیرداری، سرمایہ داری اور حبِ جاہ و منصب کی جس طرح حوصلہ شکنی اسلام نے کی تھی وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، صحابۂ کرامؓ اور اہلِ بیت عظام اور اکابر صوفیہ کی زندگیوں کا سرنامہ ہے۔ قرآن مجید کی مکی سورتوں کا توحید کے بعد سارا زور جہاں مساکین، مستضعفین، ضرورت مندوں اور محتاجوں کی کفالت کے احکام پر مشتمل ہے، وہاں دولت مندوں کو زجر و توبیخ اور اپنی دولت میں مسکینوں اور غریبوں کو شامل نہ کرنے کے تہدیدی احکام شامل ہیں اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے اُن کے لیے بہت ہی سخت عذاب کی وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ جب اس پر عمل نہیں کیا گیا اور امیر و غریب، خوش حال و فاقہ کش اور ظالم و مظلوم کے درمیان خلیج بڑھتی چلی گئی تو علامہ اقبال ایسے دیدہ ور مفکر کو کہنا پڑا ؎

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

اور

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

تحریکِ پاکستان ایک فلاحی مملکت کی نوید تھی یہی وجہ ہے کہ بھوک، افلاس، غربت، ظلم اور ناانصافی کے شکار عوام دیوانہ وار اس کی طرف لپکے۔ کرۂ ارض پر یہ نئی قائم ہونے والی مملکت صرف نمازیں پڑھوانے اور روزے رکھوانے کے لیے قائم نہیں ہوئی تھی، یہ تو پہلے بھی ادا ہو رہے تھے۔ اس لیے کہ تاریخ عالم میں ان کے سامنے تیس سال پر مبنی ایک ایسی مثالی ریاست کا نقشہ بہرحال موجود تھا، جس نے اس دھرتی پر شاہ و گدا، حاکم و محکوم، ادنیٰ و اعلیٰ اور عربی و عجمی کی تفریق مٹا کر وسائلِ رزق اور حصولِ انصاف میں سب کو مساوی درجہ دیا تھا۔ اس حکومت کے نصب العین اور منشور میں سرفہرست یہ بات شامل تھی کہ ؎

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے

اور

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست
بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ او کس را غلام

جن لوگوں کو اسلامی حکومت کے نام سے الرجی ہونے لگتی ہے وہ تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلامی حکومت سے مراد فلاحی حکومت کا قیام ہے مگر وہ خود غریبوں کو وسائلِ رزق میں برابری کی حیثیت سے شریک کرنے، ان کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہونے اور ان کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے لیے تیار نہیں، اس لیے وہ اسلامی حکومت کو ایک خوفناک ہوّا بنا کر دکھاتے ہیں۔

کچھ لوگ بھوک سے مر رہے ہیں، بچے فروخت کر رہے ہیں، اپنے اعضاء بیچ رہے ہیں، خودکشیاں ہورہی ہیں، انصاف سرعام بک رہا ہے، کروڑوں روپے کے اخراجات وصول کرنے والے ہسپتال ڈسپرین اور سرنج تک مریض کو میڈیکل سٹورز سے لینے پر مجبور کرتے ہیں، ہسپتالوں کی عمارت کا استعمال ہوٹلوں سے بھی مہنگا ہے۔ پولیس اور پٹواریوں نے عوام کا جینا دوبھر کر دیا ہے، معمولی درجے کے افسر اپنی کرسیوں پر فرعون بنے بیٹھے ہیں، سرکاری زمینیں، بنک اور جنگلات وغیرہ ہر حکومت کا وفادار طبقہ شیرِ مادر سمجھ کر ہڑپ کر رہا ہے، ظہر الفساد فی البر والبحر کی یہ کیفیت کسی ایک حکومت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر نئی بننے والی حکومت نے اس کے تناسب میں اضافہ کیا ہے ؎

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ایک طرف ملک کے ۸۰ فی صد عوام جانکنی کی اس کیفیت میں ہیں، دوسری طرف ہمارا جدید تعلیم یافتہ اور ملک کے اقتدار پر قابض مخصوص طبقہ (جو ہر دور میں شکلیں بدل کر کرسیوں پر براجمان رہا ہے) کرسی کے کھیل تماشے میں مصروف ہے تو ہمارا مذہبی طبقہ فقہی ضابطوں میں پھنسا ہوا ہے کہ کون سی چیز فقہی طور پر درست ہے اور کون سی نہیں۔ کیا خوب فرمایا حضرت اقبال نے ؎

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائلِ نظری میں الجھ گیا ہے خطیب

آج نظریۂ ضرورت بُری طرح بدنام ہے اور بعض دانش ور اور وکلاء دور کی کوڑی لاتے ہوئے اسے اپنا کارنامہ قرار دے رہے ہیں مگر آج سے صدیوں پہلے فقہا نے ایسی ہنگامی صورت حال کے لیے جس طرح کی

آج ہمارے ہاں درپیش ہے، یہ نظریہ ضرورت "الضرورات تبیح المحذورات" (ضروریات ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں) کے عنوان سے قائم کیا تھا مگر طالع آزماؤں نے اسے صرف آمرانہ حکمرانوں کو دوام بخشنے کے لیے استعمال کیا۔ آخر یہ نظریہ ضرورت ہم نے معاشی انصاف، اقتصادی مساوات، سستے اور فوری انصاف کے لیے کیوں استعمال نہیں کیا؟ اسے جاگیرداری، سرمایہ داری، بے قید معیشت سود، سٹے بازی، جُوا، مزارعت، آڑھت، غیر حاضر زمیندار کے تصور کے خاتمے کے لیے اس سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھایا؟ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
(اقبال)

ہمیں اس بات کا علم ہے کہ اس تبدیلی کے لیے شیر کا دل اور چیتے کا جگر چاہیے۔ یہ ابن الوقت طالع آزماؤں اور کرسی کو سب کچھ سمجھنے والوں کے بس کی بات نہیں ؎

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رُستم دستانم آرزو ست

اس کے لیے ایسے قائد کی ضرورت ہے جو ایسی صفات سے بہرہ ور ہو۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے
(اقبال)

ہمیں یقین ہے کہ موجودہ فرسودہ، باسی اور ردّ کردہ نظام کو ٹاکیاں لگا کر گانٹھنے سے یہ درست نہیں ہوسکتا، یہ گل سڑ کر ناکارہ ہو چکا ہے، اس کی صورت یہ ہوگئی ہے کہ ؎

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم؟

اس کے لیے بقول شاہ ولی اللہ 'فکّ کل نظام' یعنی اس نظام کی جگہ نیا، طاقت ور، مستعد اور ملک کی اکثریت کے مسائل کے حل پر مبنی نظام لانا ہوگا ورنہ نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ اس لیے کہ ؎

بدلنا ہے تو مے بدلو نظامِ مے کشی بدلو
وگرنہ جام و مینا کے بدل جانے سے کیا ہوگا؟

مجھے اس بات کا احساس اور ادراک ہے کہ مذہب کا نام لینے والوں کو صرف کھڈے لائن ہی نہیں لگایا گیا بلکہ انہیں شودروں کا درجہ دینے کی کوشش زوروں پر ہے۔ انہیں اپنے مدارس، مکاتب، مساجد اور

اسلامی شعائر کے ڈھانچے کو بچانا بھی بہت مشکل ہورہا ہے۔ساٹھ سال میں انگریز بہادر کے جانشین طبقے نے اپنی جگہ ایسے لوگوں کو لا بٹھایا ہے جو تحریکِ پاکستان کے مقاصد سے بے خبر، اسلامی طرزِ حیات سے بیگانہ اور اسلام کے لفظ سے الرجک اور پریشان نظری کا شکار ہوکر بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں لیکن آخر کوئی یہ بھی تو بتائے کہ ملک کے بڑے بڑے دینی اداروں اور جماعتوں نے سرمایہ داری، جاگیرداری، سود، جُوا، ظلم، ناانصافی، کرسی کے کھیل تماشے اور نام نہاد جمہوریت کے ناٹک کے برعکس اسلام کے فلاحی، عادلانہ اور کفالت عامہ کے عظیم الشان پروگرام پر بین الاقوامی معیار کی مختلف زبانوں میں کتنی کتابیں چھاپی ہیں؟ میرے علم کے مطابق ایک بھی نہیں؟ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

اسی طرح جدید تعلیم یافتہ طبقے کا یہ جرم بھی کسی طرح قابلِ معافی نہیں کہ چھے دہائیوں سے ملک کے سیاہ وسفید کا مالک ہونے کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ملک کو اس کے اصلی اہداف سے کوسوں دور کردیا بلکہ اس نے رشوت، ظلم، ناانصافی، آمریت، طبقاتی کشمکش، امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر کرنے کا کارِ بے خیر بڑی ہمت اور جرأت سے انجام دیا ہے۔

مختلف نسلوں اور زبانوں پر مشتمل اس ملک سے شعوری طور پر وہ لڑی نکال لی گئی جس نے اسے لڑی میں پرو کر قوم کی شکل دی تھی، وہ لڑی اسلام کی ہے۔اب قومیتوں کا جن بوتل سے باہر آیا ہے تو کسی کے قابو نہیں آرہا۔

میرے نزدیک مسلمانوں کے دورِ ملوکیت سے اب تک اسلام کا صرف ایسا چہرہ دکھایا جارہا ہے جو سرمایہ داری اور جاگیرداری کا محافظ، آمریت کا نگران اور بالادست طبقے کا معاون نظر آتا ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید، سیرت نبوی اور اکابر صوفیہ کی زندگیاں ہمہ قسم کی جاگیرداری، سرمایہ داری، ملوکیت، بندہ وآقا کے تصور اور امتیاز کی نفی کرتی ہیں۔میں نے کوشش کی ہے کہ اپنی تحریروں میں اسلام کے حقیقی اور اصلی چہرے پر ہلکے پھلکے انداز میں مگر دلائل کے ساتھ تیز روشنی پھینکوں تاکہ ملک کا نوجوان پڑھا لکھا طبقہ بالخصوص مذہب کے بارے میں تحفظات رکھنے والے احباب اس آفاقی دین کی جدت' ندرت اور انسانی مسائل کے حل کے بارے میں اس کی انقلابی سوچ پر غور کرسکیں۔اسلام مزاجاً دنیا اور اس کے مسائل سے زیادہ بحث کرتا ہے، اس کا تصور آخرت بھی دراصل مسائل دنیا کو حل کرنے کا انقلابی تصور ہے۔مادی طور پر کمزوری اور اقتدار کے خاتمے کے بعد مذہبی قیادت ناکارہ اور مفلوج ہوکر رہ گئی تو اس نے سارا زور دنیا کی تحقیر اور آخرت کی تعظیم پر مرکوز کردیا، اس سے سارا علمی ذخیرہ متاثر ہوا اور ہر چیز نے تقدس کا لبادہ اوڑھ لیا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد دنیا سے قیصریت و کسرویت کا خاتمہ تھا تا کہ انسانیت ان کے عہد کے ظلم و جور سے آزاد ہو، اس لیے کہ اس نے عوام کو معاشی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے روند ڈالا تھا۔ سوشلسٹ انقلاب کا بنیادی فلسفہ، مارکسیت، ایک کلی حقیقت کا جُزوی ادراک ہے اگر ہم مادی فکر کا سرے سے انکار کر دیں تو گزشتہ دو سو سال میں ہونے والی ساری ترقی کا انکار لازم آتا ہے۔ اس مادی تصور کو ماننا پڑے گا مگر اسے حقیقۃ الحقائق نہ مانا جائے بلکہ مادہ سے آگے وجود کو تسلیم کیا جائے۔

سود، معاشرے میں اس وقت استحصال کی سب سے بڑی شکل تھی۔ اسلام نے اسے ختم کرنے کے لیے جنگ کی دھمکی دی۔ اسلام نے معاشی استحصال کرنے والوں کے خلاف بہت سخت زبان استعمال کی ہے۔

صدیوں کی بادشاہت اور ملوکیت نے مسلمانوں کو مزاجاً شاہ پرست اور ملوکیت نواز بنا دیا ہے اور وہ اس کے سوا کچھ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس کے نزدیک ایک بہتر سے بہتر حکمران بنوعباس، بنوامیہ کا کوئی فرد ہو سکتا ہے۔ حدّ یہ کہ جو اصلاحی تحریکیں اُٹھیں، ان کا نتیجہ بھی ملوکیت کی صورت میں نمودار ہوا۔ سنوسی اور وہابی تحریکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے، اس لیے عدل و مساوات، ملوکیت کی بالادستی کا خاتمہ اور ''تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے'' کے اصول آسانی سے مسلمانوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتے۔

یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ اللہ تعالیٰ نے ساری عقل اسلاف کو دے دی تھی اور اب صرف کور دماغ لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ ایسے اشارات ہیں، جن کے پیچھے دلائل کے انبار ہیں۔ قرآنِ مجید، سیرتِ نبوی، صحابہ اور اہلِ بیت کا عمل اور اکابر صوفیہ کا طریق زندگی اسی حقیقت کا عکاس ہے۔

میرے پیشِ نظر یہ ہے کہ ملک کا باشعور طبقہ بالخصوص پڑھے لکھے نوجوان' انسان کے بنیادی یعنی اقتصادی اور معاشی مسئلے کے بارے میں اسلام کی انقلابی تعلیمات کا عام طور پر مخفی رہنے والا رُخ دیکھیں اور اسے سمجھیں اور یوں وہ اسلام کو روایتی مذہب سمجھ کر سُبک روی کا نظارہ کرتے ہوئے نظر انداز کرنے کی بجائے اپنے مسائل کا بہتر سے بہتر حل اس کے اندر تلاش کریں۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری میں تو انسانیت صدیوں سے پس رہی ہے مگر سوشلزم انتہائی دلفریب اور مسحور کن نعروں کے ساتھ میدانِ عمل میں آیا۔ ہر چند سوشلزم ایک کلی حقیقت (اسلام) کا جُزوی ادراک ہے تاہم عملی دنیا میں وہ پچاس سال کا جھٹکا بھی برداشت نہ کر سکا۔ دنیا اسلام کے اس روشن اور تابناک چہرے کی رونمائی کی شدت سے منتظر ہے اور زُبانِ حال سے کہہ رہی ہے ؎

کب ڈُوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟

دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

اسلام اور مغرب ڈاکٹر محمد امین

اسلامی تناظر میں
مغربی سائنس وٹیکنالوجی کی مخالفت

البرہان میں جاری بحث کے حوالے سے مدیر کا نقطۂ نظر

پچھلے سال ڈیڑھ سے البرہان میں مغربی سائنس وٹیکنالوجی کی اسلامی حیثیت پر ایک علمی مباحثہ جاری ہے۔ ہم اس بحث کو قارئین کے ذہن میں تازہ کرنے کے لیے اس کا خلاصہ پیش کرنے کے بعد اپنا نقطۂ نظر واضح کریں گے:

- البرہان جنوری ۲۰۱۱ء میں اسلام اور مغربی ٹیکنالوجی کے حوالے سے ایک علمی مذاکرے کی روداد چھپی جس میں راقم کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مغربی ٹیکنالوجی مغرب کے ملحدانہ ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کی پیداوار ہونے کی وجہ سے اپنی کنہ اور استعمال دونوں میں اقدار کش ہے اور اسلامی اصول و اقدار کی نفی کرتی ہے لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلامی ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کی روشنی میں اپنے معاشرے اور تہذیب کی تعلیمی و تحقیقی روایت کو زندہ و متحرک کریں تا کہ ایسی سائنس وٹیکنالوجی وجود میں آ سکے جو اسلامی اصول و اقدار سے ہم آہنگ ہو، جیسا کہ ہم ماضی میں اس کا کامیاب تجربہ کر چکے ہیں۔

- البرہان فروری، مارچ ۲۰۱۱ء میں ڈاکٹر نعمان ندوی صاحب کا مضمون طبع ہوا کہ مسلم ترقی کے لیے سائنس وٹیکنالوجی غیر اہم ہے۔

- البرہان جولائی، اگست ۲۰۱۱ء میں مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج کے عنوان سے خالد جامعی صاحب اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کا نقطۂ نظر شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے مغربی سائنس وٹیکنالوجی کو غیر اسلامی اور مسلم معاشرے کے لیے غیر مفید قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کا ایک ہی حل ہے کہ مسلمان مغربی ٹیکنالوجی کا استعمال ترک کر دیں۔☆

☆ بعض دینی جماعتیں بھی یہی رائے رکھتی ہیں، مثلاً جماعۃ الدعوۃ والے اپنے معتقدین میں گھروں میں رکھے ٹی وی توڑنے کی مہم چلاتے ہیں۔ ان کے ایک بڑے عالم ایک دفعہ ہمارے ہاں 'جہاد اور اس کی عصری تطبیقات' پر ایک علمی مذاکرے میں تشریف لائے اور فرمایا کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی سائنس اور ٹیکنالوجی کی یونیورسٹی قائم کی تھی؟ آپؐ نے صرف جہاد کا حکم دیا تھا اور مسلمانوں نے جو کچھ ان کو اس وقت میسر تھا، اس سے جہاد کیا تھا......اور کامیاب

ہوئے تھے اور یہ کہ ہمارے لیے قابل تقلید نبی کریم ﷺ، صحابہؓ اور اسلاف کا طرزِ عمل ہے جس میں ٹیکنالوجی کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی''۔

- البرہان ستمبر ۲۰۱۱ء میں پروفیسر شاہد رشید صاحب نے اس مضمون پر مختصر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ٹیکنالوجیکل ترقی اور اخلاقی اقدار میں تضاد لازم وملزوم نہیں گو مغرب کی موجودہ تہذیب میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔

- البرہان ستمبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۱ء میں خالد جامعی صاحب کا مضمون 'اسلام، مسلمان اور سائنس و ٹیکنالوجی' چھپا جس میں انہوں نے مغربی ٹیکنالوجی کے خلاف اقدار اور مسلمانوں کے لیے مضر ہونے کے موقف کو نئے آہنگ سے پیش کیا۔

- البرہان مارچ، اپریل، مئی ۲۰۱۲ء میں پروفیسر زاہد صدیق مغل صاحب کے موقف کی تین قسطیں بعنوان 'سائنسی علمیت اور اسلام' طبع ہوئیں جس کے مطابق مغربی سائنس و ٹیکنالوجی مغرب کے ملحدانہ نظریۂ علم کی پیداوار ہے، جس کا منبع مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام ہے، لہٰذا یہ سائنس و ٹیکنالوجی اسلامی اصول و اقدار کی نفی کرتی ہے اور مسلمانوں کو اسے رد کر دینا چاہیے۔

- البرہان کے جون ۲۰۱۲ء کے شمارے میں محمد رشید صاحب نے 'سائنس کی مخالفت کے جواب میں' کے عنوان سے پروفیسر عبدالوہاب سوری صاحب اور پروفیسر زاہد صدیق مغل صاحب کے موقف کو انتہا پسندی پر مبنی قرار دیتے ہوئے کہا کہ اسلام سائنسی تحقیقات اور ٹیکنالوجی کی مخالفت نہیں کرتا لہٰذا مغربی سائنس و ٹیکنالوجی کی مخالفت اور مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دینا مسلمانوں کو سائنس و ٹیکنالوجی سے محروم رکھنے کی ایک 'سازش' ہے۔

- البرہان جولائی ۲۰۱۲ء میں وسیم الطاف صاحب کا ایک مضمون 'سائنس اور ہماری ترجیحات' کے عنوان سے چھپا جس میں مصنف نے بتایا کہ مسلمان تحقیق اور سائنس و ٹیکنالوجی میں کتنے پیچھے ہیں اور یہی ان کی پسماندگی کا بڑا سبب ہے۔

خالد جامعی صاحب، ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب اور پروفیسر زاہد صدیق مغل صاحب نے محمد رشید صاحب کر جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ جناب خالد جامعی صاحب نے اپنے ایک سابقہ مضمون میں یہ کہا تھا کہ ان لوگوں سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں جنہوں نے مغربی مآخذ کو نہیں پڑھا۔ ان کی رائے میں جو لوگ موضوع پر عبور نہیں رکھتے ان کے ساتھ ڈائیلاگ کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اس کے باوجود انہیں ہر وہ پلیٹ فارم استعمال کرنا چاہیے جہاں انہیں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے اور مخالف نقطۂ نظر کی

تغلیط کا موقع ملے۔ نیز عرصے سے یہ سننے کے باوجود کہ ان موضوعات پر ان کے ہاں ہزاروں صفحات لکھے جا چکے ہیں کوئی سلسلۂ کتب اور منضبط لٹریچر ابھی تک سامنے نہیں آیا جس سے ہم جیسے عامی لوگ استفادہ کر سکتے لہٰذا اب ہم اپنا نقطۂ نظر قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا حضرات میں سے کوئی صاحب یا کوئی اور صاحبِ علم اگر اس موضوع پر کچھ کہنا چاہیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔ تاہم یہ امر ذہن میں رہے کہ البرہان کے صفحات محدود ہیں اور وہ اپنی دلچسپی کے دوسرے دائرے بھی رکھتا ہے اور ان سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اس طرح کے دقیق علمی موضوعات پر کسی ایک مصنف کی تحریر کو قسط وار بہت طول دینا قارئین کی دلچسپی اور مضمون کی افادیت کو مجروح کرتا ہے لہٰذا مضمون نگار حضرات سے گزارش ہے کہ وہ البرہان کے ۱۰، ۱۲ صفحات کی دو تین قسطوں (یعنی زیادہ سے زیادہ ۴۰، ۴۵ صفحات) سے زیادہ لمبا مضمون نہ بھیجیں کیونکہ کسی ایک موضوع پر مضمون اگر سوڈیڑھ سو صفحے کا ہو تو اسے کتابی صورت میں طبع کرنا زیادہ مناسب ہے، البتہ اس کی تلخیص رسالے میں دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس اپنی غیر مطبوعہ کتب موجود ہیں لیکن ہم نے انہیں البرہان میں قسط وار دینے کا کبھی نہیں سوچا۔ ہم خالد جامعی صاحب اور زاہد صدیق مغل صاحب سے معذرت خواہ ہیں کہ مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر ہم البرہان میں تین قسطوں سے زیادہ ان کا موقف نہ دے سکے حالانکہ ہمیں ان کے خیالات کے اہم اور قیمتی ہونے کا احساس بھی ہے اور اصولی طور پر ان سے اتفاق بھی۔ امید ہے وہ ہماری مجبوری کا احساس فرمائیں گے۔

اس تمہید کے بعد، جو طولانی ہوگئی، ہم عرض کرتے ہیں کہ:

۱۔ بلاشبہ یہ نقطۂ نظر صحیح ہے کہ موجودہ مغربی سائنس و ٹیکنالوجی اپنی اصل اور استعمال دونوں لحاظ سے اقدار کش ہے اور یہ ہم ہی نہیں کہتے خود بہت سے مغربی فلاسفہ اور دانشور بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں (جن کے حوالے سابقہ مباحث میں گزر چکے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا سائنسی منہاج (Scienticism) جو مغربی سائنس و ٹیکنالوجی کی بنیاد ہے، ایک ایسے فلسفۂ علم (Epistemology) پر مبنی ہے جو خود گمراہ کن ہے کیونکہ وہ وحی کی برتری اور مذہب و اخلاق کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتا اور عقلی بنیادوں پر حسّی علوم (یعنی تجربہ و مشاہدہ) یا تجربی علوم (Empirical Sciences) ہی کو حتمی علم سمجھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فلسفۂ علم کی بنیاد ایک ایسے ورلڈ ویو پر ہے جس کی اساس ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، لبرلزم اور میٹریلزم جیسے انسانی وضع کردہ نظریات ہیں جو انسانی زندگی میں اللہ، رسول اور آخرت جیسے بنیادی عقائد کے کسی کردار کی نفی کرتے ہیں اور جن کے نزدیک ایک خود مختار بلکہ مختار مطلق انسان اور صرف دنیاوی زندگی اور اس کی آسائشیں ہی وہ بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر انسانی اعمال اور

رویوں کا مدار ہونا چاہیے۔

۲۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ اسلام کی بنیاد توحید، رسالت اور آخرت کا عقیدہ ہے جو دنیاوی زندگی گزارنے کا مکمل لائحہ عمل دیتا ہے جس کی اساس الٰہی ہدایت پر ہے۔ یہ عقیدہ اگرچہ آخرت کی دنیاوی زندگی پر ترجیح اور اللہ کے علم (وحی) کی انسانی علوم پر برتری کا داعی ہے لیکن دنیاوی زندگی کے لیے تسخیر کائنات اور حسی و تجربی علوم کے استعمال و افادیت کا منکر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں مسلمانوں نے تجربی علوم اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کی لیکن علماء دین نے کبھی اس کے غیر اسلامی ہونے کا فتویٰ نہیں دیا اور نہ کبھی دینی تعلیمات اور تجربی علوم میں مغائرت اور تضاد کا کوئی حادثہ مسلم معاشرے کو پیش آیا۔

۳۔ اور بلاشبہ یہ نقطۂ نظر غلط ہے کہ ترقی، قوت اور عظمت کی بنیاد سائنس و ٹیکنالوجی ہے اور مغرب چونکہ سائنس و ٹیکنالوجی میں ہم سے آگے ہے لہٰذا مسلمانوں کو مغربی سائنس و ٹیکنالوجی اپنا لینی چاہیے اور سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب کی پیروی کرنی چاہیے۔

صحیح نقطۂ نظر جو قرآن حکیم اور سابقہ تہذیبوں کے عروج و زوال کے مطالعہ سے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ قوموں کی ترقی اور قوت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ افراد معاشرہ اس نظریۂ حیات یا ورلڈ ویو کے ساتھ مکمل اور شدید وابستگی رکھتے ہیں یا نہیں جس پر وہ یقین و ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان میں وہ بنیادی اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جو ترقی اور قوت کی بنیاد ہیں جیسے محنت، پابندیٔ وقت، ایثار، تنظیم، منصوبہ بندی، قیادت کی پیروی، قانون کی پابندی وغیرہ۔

اور یہ کہ ورلڈ ویو یا نظریۂ حیات کے حوالے سے انسانیت ابتداء ہی سے دو گروہوں میں بٹی چلی آ رہی ہے۔ ایک وہ گروہ جو زمین میں زندگی گزارنے کا لائحہ عمل اپنے اس خالق و مالک سے لیتا ہے جو قوت و ہدایت کا منبع ہے۔ اگر یہ گروہ اپنے خالق کی ہدایت پر کما حقہٗ عمل کرے تو اس میں وہ اوصاف اور خصوصیات بدرجہ اتم پیدا ہو جاتی ہیں جو دنیا میں ترقی و قوت کے لیے ضروری ہیں اور خالق کی نصرت بھی اسے حاصل ہوتی ہے لہٰذا دنیا کی کوئی دوسری قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس گروہ میں ترقی کا مطلب ہوتا ہے اس دنیا میں ایسی ترقی جس کا نتیجہ آخرت کی کامیابی ہو۔ مسلمانوں نے اس ماڈل کے مطابق دنیا کو ترقی کر کے دکھائی جس میں اسباب دنیا یعنی سائنس و ٹیکنالوجی بھی موجود تھی لیکن بنیادی انحصار ایمان و اخلاقی قوت اور نصرت الٰہی پر تھا۔

دوسرا گروہ جو کسی خالق اور الٰہ کے وجود اور اس کی ہدایت کو نہیں مانتا بلکہ انسان اور انسانی عقل ہی کو اپنے نظریۂ حیات اور اپنے ورلڈ ویو کا منبع مانتا ہے اور اس دنیا کی زندگی ہی کو حتمی اور آخری سمجھتا ہے۔ یہ بھی

ترقی کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے افرادِ معاشرہ اپنے نظریۂ حیات سے گہری وابستگی رکھتے ہوں اور اس وابستگی کے نتیجے میں ان کے اندر وہ بنیادی اوصاف اور خصوصیات پیدا ہو چکی ہوں جو اس دنیا میں حصول اسباب کے لیے ضروری ہیں۔ ایسا گروہ دوسروں پر بھی غالب آ سکتا ہے اگر اس کے مقابلے میں پہلا گروہ موجود نہ ہو اور اسباب دنیا (یعنی سائنس وٹیکنالوجی) میں وہ دوسروں سے آگے ہو۔ اس گروہ کے نزدیک 'ترقی' سے مراد صرف اس دنیا کی ترقی ہوتی ہے کیونکہ آخرت کی کامیابی تو اس کے پیشِ نظر ہوتی ہی نہیں۔

۴۔ مندرجہ بالا وضاحت سے ظاہر ہے کہ دنیا میں ترقی کرنے اور قوت حاصل کرنے کے دو ماڈل ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں لہٰذا ایک ماڈل کے افراد اور معاشرے دوسرے ماڈل کے افراد اور معاشروں کی پیروی اور نقل کر کے ترقی نہیں کر سکتے بلکہ ان میں سے جو گروہ ایسا کرے گا وہ مزید پسماندہ اور کمزور ہوتا جائے گا کیونکہ دوسرا تہذیبی گروہ اس سے متضاد اصولوں پر کھڑا ہوتا ہے۔

۵۔ مندرجہ بالا اصولوں کے اطلاقی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ پہلے ماڈل کے مطابق مسلمانوں نے صدرِ اول میں 'ترقی' اور 'قوت' حاصل کر لی، جس میں بنیادی حیثیت اپنے نظریۂ حیات سے وابستگی (یعنی ایمانی و اخلاقی) برتری اور نصرت الٰہی کو حاصل تھی۔ دنیاوی اسباب (سائنس و ٹیکنالوجی) بھی موجود تھے لیکن ان کو فیصلہ کن حیثیت حاصل نہ تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ تم کمزور اور تعداد میں کم ہو تو بھی فتح پا سکتے ہو اور مسلمانوں نے عملاً ایسا کر کے دکھا دیا اور جب ان میں وہ خصوصیات نہ رہیں تو وہ زوال پذیر ہو گئے۔

دوسری طرف ترقی و قوت کے حصول کا دوسرا ماڈل ہے جس کا مظہر اس وقت یورپ و امریکہ ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا کہ یہ ماڈل اللہ، رسول اور آخرت کے انکار اور انسان کی خدائی پر مبنی ہے اور اس میں قوت و ترقی کا انحصار دنیا کے اسباب پر رسائی (سائنس وٹیکنالوجی) پر ہے نہ کہ ایمانی قوت اور نصرت الٰہی پر۔ اس ماڈل پر کاربند تہذیبی گروہ اس لیے کامیاب ہے کہ پہلا ماڈل موجود نہیں۔

لہٰذا عقلی اور منطقی طور پر (ایمانی تقاضا تو ہے ہی) پہلے ماڈل کے لوگ دوسرے ماڈل کی پیروی کر کے ترقی نہیں کر سکتے اور نہ قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے ماڈل کے مطابق ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر مسلمان دنیا میں ترقی کرنا اور قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کی یہ مجبوری ہے کہ وہ اسلام پر عمل کریں اور اچھے عملی مسلمان بن جائیں کیونکہ اگر وہ دوسرے ماڈل (یعنی مغربی تہذیب کے ماڈل کی) پیروی کی کوشش کریں گے تو قوت اور ترقی کی بجائے مزید کمزور ہوں گے اور مزید ذلیل و

رسوا ہوں گے۔

یہ بھی واضح ہو چکا کہ پہلے ماڈل میں ترقی اور قوت کی بنیاد ایمانی و اخلاقی حالت اور نصرت الٰہی پر ہے اور اسباب دنیا (سائنس وٹیکنالوجی) کو اس میں فیصلہ کن اہمیت حاصل نہیں ہے (اور آج اگر چہ صحیح اور سچا اسلامی معاشرہ موجود نہیں ہے لیکن یہ ماڈل پھر بھی کبھی کبھی اپنی جھلک دکھا دیتا ہے جیسے لیبیا، سوڈان، الجزائر اور انڈونیشیا میں مسلمانوں نے کمزور ہونے کے باوجود لڑ کر آزادی حاصل کر لی اور افغان مسلمانوں نے دنیاوی لحاظ سے کمزور اور سائنس وٹیکنالوجی میں پسماندہ ہونے کے باوجود روس جیسی سپر پاور کو شکست دی اور اب وہ امریکہ و یورپ کو بھی شکست سے دو چار کر چکے ہیں)۔ لہٰذا مسلمان اگر دنیا میں ترقی کرنا اور قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایمانی، عقلی، منطقی اور سائنسی تقاضا یہ ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر کماحقہٗ عمل کریں، عملاً اچھے مسلمان بن جائیں اور اپنے آپ کو نصرتِ الٰہی کا حق دار ثابت کر دیں۔ اگر وہ اہل مغرب کی پیروی اور مغربی سائنس وٹیکنالوجی میں پناہ لینے کی کوشش کریں گے تو مزید کمزور ہوں گے، مزید ذلیل و رسوا ہوں گے۔

۶۔ اپنی یہ بنیادی تھیم واضح کرنے کے بعد، کہ اسلام کے تہذیبی ماڈل کے پیروکار غیر اسلامی (مغربی) تہذیبی ماڈل کی پیروی کر کے نہ تو ترقی کر سکتے ہیں اور نہ قوت حاصل کر سکتے ہیں، ایک ضمنی بات کی وضاحت بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ مختلف تہذیبوں کو (خواہ وہ اسلامی ہوں یا غیر اسلامی) دنیاوی علوم، تمدنی ترقی، تسخیر کائنات اور اکتساب اسبابِ دنیا کے حوالے سے، انسانی تاریخ کا ایک مسلسل سفر سمجھنا چاہیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شعبوں میں، بعد میں آنے والی ہر تہذیب اپنا سفر وہاں سے شروع کرتی ہے جہاں پہلی تہذیب نے اسے چھوڑا ہو۔ لہٰذا ایک تہذیبی ماڈل اپنی بنیادی اور منفرد خصوصیات پر قائم رہتے ہوئے ان شعبوں میں اپنے سے پہلے تہذیبی ماڈل سے استفادہ کر سکتا ہے اور یہ استفادہ اس کے لیے کسی مضرت کا سبب نہیں بنتا کیونکہ وہ بتدریج اس طرح کے ضمنی استفادے کو اپنے تہذیبی رنگ اور ماڈل میں ڈھال کر اپنا جزو بنا لیتا ہے مثلاً حضرت عمرؓ جیسے حساس مجتہد اور ذکی مدبر نے ایرانیوں کے انتظامی اور مالیاتی ماڈل (نظام دیوان) سے استفادے میں کوئی ہرج نہیں سمجھا اور نہ صحابہؓ میں سے کسی نے اس کی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ عبدالملک کے عہد تک مسلمانوں کی کرنسی بھی اپنی نہ تھی اور لینڈ ریونیو کا سارا انتظام اور ریکارڈ بھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں اور مقامی زبانوں میں تھا لیکن کبھی کسی محدث یا فقیہ نے اس کے خلاف اسلام ہونے کا فتویٰ نہیں دیا۔ اسی طرح مغربی تہذیب نے نشأۃ ثانیہ کے وقت مسلمانوں کی تجربی علوم میں پیش رفت اور یونانی علوم کی بحفاظت منتقلی سے استفادہ کیا اور اسے اپنی اسلام سے متصادم تہذیب کا جزو بنا کر اپنے رنگ میں ڈھال لیا اور ان کی موجودہ نسلوں کو یہ پتہ ہی

نہیں کہ ان کے اجداد نے ایسا کیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ تہذیبیں ہوا بند خانوں (Air tight compartments) میں پروان نہیں چڑھتیں بلکہ ایک دوسرے سے جزوی استفادہ بھی کرتی ہیں لیکن اپنے منفرد ماڈل اور پیراڈائم کو برقرار بھی رکھتی ہیں۔ جب اسلامی تہذیب غالب تھی تو مسلمانوں نے بھی پہلی تہذیبوں سے استفادہ کیا اور اس طرح کا استفادہ آج بھی حرام نہیں۔ البتہ آج ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اسلامی تہذیب اس وقت غالب نہیں، مغلوب ہے اور مغربی تہذیب جو اِس وقت غالب ہے وہ اسلام سے مخالف اور متصادم پیراڈائم رکھتی ہے لہٰذا مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کی پیروی کرنا خطرناک اور نقصان دہ ہے بلکہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ آزادانہ استفادہ اور چیز ہے اور غلامانہ پیروی چیزے دیگر۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عصر حاضر میں حریت فکر اور اجتہاد کے قائل ہیں لیکن پرویز اور غامدی جیسے ان لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کو مغربی فکر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حاصل اس مبحث کا یہ ہے کہ جس طرح یہ غلط ہے کہ مغرب سے سب کچھ لے لیا جائے اور اس کی پیروی کی جائے، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ مغربی تہذیب سے استفادے کو حرام سمجھا جائے اور اسے کلیتاً رد کر دیا جائے کیونکہ ایک زندہ تہذیب انسانی تجربے کے طور پر دوسری تہذیبوں سے اخذ و استفادہ کرتی ہی ہے خواہ وہ اس کے مخالف اصولوں پر ہی قائم ہو۔ آپ کتابی طور پر ایک اصول بنا بھی لیں تو اس کا کیا فائدہ جب عملی زندگی میں اس پر عمل ممکن نہ ہو۔ ہاں! مسلم تہذیب چونکہ اس وقت مغلوب ہے لہٰذا ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے اور اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ غلبہ وقوت کے لیے مسلم تہذیب کے احیاء اور غلبے کے لیے جدوجہد کی جائے نہ کہ ملحدانہ مغربی فکر وتہذیب کی پیروی کو رواج جائے۔

۷۔ عالم اسلام میں اس وقت حکمران اور پڑھا لکھا طبقہ مغرب کا ذہنی غلام ہے اور ان کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ مسلمان معاشرے سیاسی عدم استحکام، معاشی پسماندگی اور تعلیمی زبوں حالی کا شکار ہیں اور مسلم ممالک میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کا فقدان ہے۔ اِن حالات میں یہ سوچنا کہ عالم اسلام اپنے نظریاتی تناظر میں ایسی سائنس وٹیکنالوجی کو فروغ دے سکتا ہے جو اس کے فکری ڈھانچے سے موافقت رکھتی ہو محض جاگتے میں خواب دیکھنے والی بات ہے جس کا عملی دنیا میں کوئی امکان نہیں۔ اگرچہ مطلوب یہی ہے۔

۸۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نظری باتیں چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ عملی حل کیا ہے؟ ہمیں دوٹوک انداز میں بتائیں کہ ہم مغرب کی ٹیکنالوجی استعمال کریں یا نہیں؟ اور کیا مغرب کی ٹیکنالوجی استعمال کرنا غیر

اسلامی ہے؟ ہم ان شاء اللہ اس سوال کا دوٹوک جواب دیں گے لیکن اس سے پہلے ہماری کچھ گزارشات پر غور فرمالیجیے:

اولاً صحابہ کرامؓ کے معاشی حالات اور طرزِ حیات میں فرق موجود تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ نے کبھی اس فرق کی مذمت نہیں کی اور نہ کبھی قوت سے اسے مٹانے کی کوشش کی اور نہ یہ بات ان کے درمیان اخوت ومحبت کی کمی کا سبب بنی۔ حضرت بلالؓ غریب تھے اوران کے پاس اپنی رہائی (مکاتبت) کے لیے بھی پیسے موجود نہ تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ امیر تھے اور انہوں نے حضرت بلالؓ کو خرید کر اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک داماد غریب تھے (حضرت علیؓ) اور دوسرے امیر تھے (حضرت عثمانؓ) اور پبلک ویلفیئر کے کام کرتے تھے، جیسے انہوں نے میٹھے پانی کا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ اسی طرح حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف بھی بہت امیر تھے اور جب فوت ہوئے تو سونے کے ڈلے کاٹ کاٹ کر ان کے ورثاء میں تقسیم ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فقر اختیاری تھا۔ ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر معاشی اور معاشرتی زندگی گزار سکتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کو اسوۂ حسنہ کی پیروی کا حکم معلوم تھا اور انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مثالی محبت بھی تھی لیکن انہوں نے یا بعد میں امت نے اسے کبھی حکم عام نہیں سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فقر اختیاری کی لازماً پیروی کریں مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکہری چادر بچھا کر فرش پر سوتے تھے؟ سوال یہ ہے کہ کیا سارے صحابہؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے اور کیا مسلمان پچھلے چودہ سو سال سے ایسے ہی سو رہے ہیں؟ اور کیا کسی محدث، مفسر، فقیہ نے پچھلے چودہ سو سال میں چارپائی یا پلنگ (جو ٹیکنالوجی ہی کی ابتدائی شکلیں ہیں) پر گدا ڈال کر سونے کو غیر اسلامی فعل قرار دیا ہے؟ اس کی مذمت کی ہے اور اس پر عمل کو برا سمجھا ہے؟ کیا مالی کشادگی اور طرزِ زندگی میں راحت کی خواہش اور کوشش ناپسندیدہ اور غیر اسلامی ہے؟ اور کیا مفلسی اور مشقت کی زندگی گزارنا شرعی تقاضا ہے؟

گویا سوال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ٹیکنالوجی جس حالت میں تھی یا تمدنی زندگی میں جو سہولتیں اس وقت میسر تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس ٹیکنالوجی کو ترقی دینا اور تمدنی زندگی میں مزید سہولتیں پیدا کرنا کیا غیر اسلامی اور اسوۂ حسنہ کی خلاف ورزی ہے؟ ابن خلدون اور ٹائن بی نے تہذیبوں کی زندگی اور مدارج کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے قطع نظر خالص فقہی نقطۂ نظر سے ہماری طالب علمانہ رائے میں یہ غیر اسلامی نہیں ہے اور اس کا حکم اباحت کا ہے۔ ہاں! جب کوئی چیز یا اس کا استعمال خلاف اسلام امور کو مستلزم ہو تو اس کی حرمت اور کراہت کا حکم دیا جائے گا ورنہ تو اسلام پر جمود و تعطل کا الزام آئے گا اور اسلام اس سے بری ہے کیونکہ وہ قیامت تک کے لیے قابل عمل ہے اور اس میں اجتہاد کی سپرٹ کا یہی مفہوم اور تقاضا ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش موجود ہے لیکن مضمون کی

مناسبت سے ہم اس اجمال پر اکتفا کرتے ہیں۔ تاہم واضح رہے کہ یہ ہماری ایک رائے ہے جو غلط بھی ہوسکتی ہے اور اگر ہم پر کبھی اس رائے کا غلط ہونا واضح ہو گیا تو ہم اس سے رجوع کرنے میں، ان شاء اللہ، تاخیر نہیں کریں گے۔

ثانیاً صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جب اشیاء صَرف بڑے پیمانے پر تیار ہونے لگیں تو مغربی تاجروں کو منڈیوں کی تلاش ہوئی چنانچہ مسلمان ممالک پر قبضے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اہل مغرب نے یہاں سے خام مال سستے داموں خریدا اور اسے اپنی فیکٹریوں میں پراسیس کر کے مسلمان ملکوں ہی کو مہنگے داموں بیچنا شروع کر دیا۔ اس طرح اس نے اپنی ٹیکنالوجی سے تیار کردہ اشیاء صرف مسلمان ملکوں میں کھپانی شروع کیں۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آج مسلمان معاشرے اگر مغربی ٹیکنالوجی سے تیار کردہ اشیاء کے خوگر ہو چکے ہیں تو اس میں ان کی خوشی، رضامندی اور خواہش کا دخل کم اور تاریخی جبر کا حصہ زیادہ ہے۔ یہ چیز ان پر تھونپ دی گئی، انہیں قبول کرنا پڑی اور اب وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔

ثالثاً امریکہ و یورپ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اس کے دلائل اتنے کثیر اور معروف ہیں کہ ان کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر دنیا کے ۵۷ ممالک کے دو ارب مسلمان اہل مغرب کو اپنا خام مال دینا بند کر دیں، ان کے بنکوں سے اپنے پیسے نکلوالیں، ڈالر اور یورو سے نسبت ختم کر دیں اور ان کی ٹیکنالوجی سے تیار کردہ اشیاء صَرف خریدنا بند کر دیں تو امریکہ و یورپ کے سارے ممالک چند ہفتوں میں دیوالیہ ہو جائیں گے، ان کی معیشت تباہ ہو جائے گی، سیاسی برتری ختم ہو جائے گی اور امریکہ سپر پاور نہیں رہے گا۔ اتنے بڑے نتائج، بغیر کسی جنگ کے، بغیر خون بہائے! اگر ہم مسلمانوں میں عقل ہو، جرأت ہو اور اتحاد ہو تو یہ سب ممکن ہے لیکن امریکہ و یورپ بھی بہت عقل مند و ہوشیار ہیں۔ وہ یہ ساری باتیں سمجھتے ہیں اور انہوں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ مسلمان یہ سب کچھ نہ کر سکیں۔ اس کے لیے انہوں نے جو حکمت عملی وضع کی ہے اس کے اہم نکات میں مسلمانوں کو ذہنی و فکری طور پر غلام بنائے رکھنا، مقتدر طبقوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنا، مسلم معاشرے کو اسلامی تعلیمات پر (خصوصاً ریاستی سطح پر) عمل پیرا نہ ہونے دینا اور مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار کو مسلم معاشرے میں رواج دینا (کبھی امن کے لبادے میں اور کبھی ڈنڈے کے زور سے) اور مسلمانوں کو متحد نہ ہونے دینا شامل ہیں۔ نیز! ان مقاصد کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال بھی ان کی حکمت عملی میں شامل ہے جس کی چند صورتیں یہ ہیں:

- انفارمیشن ٹیکنالوجی اور پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا ٹیکنالوجی کا مسلم ممالک میں غیر اسلامی استعمال
- برتر حربی ٹیکنالوجی سے مسلم ممالک کی تباہی (جیسے عراق، افغانستان اور لیبیا کی تباہی کے بعد

پاکستان پر ڈرون حملے)۔

- مسلمان آبادی کم رکھنے کے لیے مانع حمل سامان، ادویات اور آپریشن کے آلات کی مسلم ملکوں کو فراہمی
- مسلم نظامِ تعلیم کی کیلکولیٹر، لیپ ٹاپ، انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل ریسرچ کلچر سے تباہی
- مسلم معاشرتی اقدار کی تباہی بذریعہ موبائل، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ، کیمرا اور میڈیا وغیرہ
- بھارت کا مغربی ٹیکنالوجی کے استعمال سے ڈیم بنا کر پاکستان کو پانی اور بجلی سے محروم کرنا اور اسے بنجر بنانا۔

خلاصہ یہ کہ ٹیکنالوجی اس وقت قوت وسطوت کا مظہر اور وسیلہ ہے۔ اسی وجہ سے مغرب نہیں چاہتا کہ مسلم ممالک اس ٹیکنالوجی خصوصاً اعلیٰ حربی ٹیکنالوجی کے حامل ہو جائیں۔

سطور بالا میں ذکر کردہ سائنس و ٹیکنالوجی سے متعلق بعض مثبت اور منفی نکات کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم تلخیصاً کہہ سکتے ہیں کہ:

☆ مطلوب یہی ہے کہ مسلمان اپنی ٹیکنالوجی خود تخلیق کریں جو ان کے فکری پیراڈائم سے ہم آہنگ ہو اور عزیمت کا راستہ یہی ہے کہ مغربی ٹیکنالوجی استعمال نہ کی جائے۔

☆ لیکن عامۃ الناس سے چونکہ عزیمت کی توقع نہیں رکھی جاسکتی اور نہ مسلم معاشرے میں اسلامی ٹیکنالوجی میں پیش رفت کا مستقبل قریب میں کوئی امکان ہے لہٰذا قابل عمل راستہ یہی ہے کہ جس ٹیکنالوجی کے استعمال سے فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہو، اسے استعمال کر لیا جائے مثلاً بجلی، ٹیلی فون، بلب، پنکھے، ائیر کنڈیشنر، کاغذ، بال پوائنٹ، میز، کرسی، موٹر سائیکل، کاریں، بسیں، ٹرک، ریلوے، ہوائی جہاز، پرنٹنگ پریس وغیرہ۔

☆ جن چیزوں کے استعمال کا نقصان ان کے فائدے سے زیادہ ہے انہیں استعمال نہ کیا جائے یا احتیاط کے ساتھ محدود استعمال کیا جائے جیسے ٹی وی، انٹرنیٹ، موبائل وغیرہ۔

☆ جو ٹیکنالوجی مسلم معاشرے کے لیے مفید ہو اور اسے دفاعی لحاظ سے مضبوط بناتی ہو اسے حاصل کرنا ضروری ہے جیسے ٹینک، جنگی جہاز، میزائل اور ایٹمی اسلحہ یا بنیادی صنعتوں (ٹیکسٹائل، شوگر، ادویات وغیرہ) کی مشینری

ہم نے اپنی طرف سے بحث سمیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی صاحب علم اگر ہمارے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے اظہار خیال کرنا چاہیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

اتحاد بین المسالک　　　عرفان احمد ☆

اتحاد امت اور ملی یک جہتی

پاکستان میں اسلامی حوالے سے کرنے کے اہم کام

اگرچہ اتحاد امت اور ملی یکجہتی کے بھاری بھر الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ان سے مراد پاکستان میں اتحاد بین المسالک اور مختلف دینی عناصر کے درمیان فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یکجہتی کو فروغ دینا ہوتا ہے۔

پاکستان میں معاشرے کو اسلام پر چلانے اور ریاستی قوت کو اسلامی تعلیمات کے نفاذ کے لیے استعمال کرنے میں چونکہ ایک بڑی رکاوٹ دینی عناصر میں انتشار و افتراق ہے اس لیے ملک کے فہیم عناصر کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ کسی طرح ان دینی مسالک میں اتحاد کو فروغ دیا جائے اور ان کے درمیان یکجہتی کے لیے کوششیں کی جائیں۔ اس افتراق کا ایک بڑا مظہر یہ ہے کہ پاکستان میں نہ صرف مساجد و مدارس فرقہ وارانہ بنیادوں پر کام کرتے ہیں بلکہ یہاں دینی سیاسی جماعتیں بھی مسالک کی بنیاد پر بنی ہوئی ہیں۔ اس تناظر میں خود دینی سیاسی جماعتوں کے اندر سے اتحاد کی آواز اٹھی اور بارہ تیرہ سال پہلے جماعت اسلامی کے قاضی حسین احمد نے ملی یک جہتی کونسل کے پلیٹ فارم سے نہ صرف شیعہ سنی منافرت کم کرنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں مثبت کردار ادا کیا بلکہ اس اتحاد کو آگے چل کر سیاسی اتحاد میں بدل دیا اور متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے) کے نام سے ایک سیاسی اتحاد قائم ہو گیا۔ عوام نے اس اتحاد کو پذیرائی بخشی، دینی کارکنوں کو تقویت ملی اور ایم ایم اے صوبہ سرحد میں حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی اور بلوچستان میں حکومت کا حصہ بن گئی۔ بدقسمتی سے ایم ایم اے اچھی کارکردگی نہ دکھا سکی، باہمی اتحاد میں بھی رخنے پڑے اور ملی یکجہتی کونسل اور ایم ایم اے دونوں غیر مؤثر اور غیر فعال ہو گئے۔

اس خلاء کو پورا کرنے کے لیے ملی مجلس شرعی، وجود میں آئی جس نے بین المسالک اتحاد اور ملی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے قابل قدر کاوشیں کیں لیکن اس کا دائرہ کار زیادہ تر علمی، فکری اور فقہی تھا اور اس

☆ ایڈیٹر نوائے کسان، لاہور

نے دینی سیاسی قائدین کی بجائے دینی مدارس اور علماء کرام کے درمیان کام کرنے کی راہ اپنائی۔ اب حال ہی میں قاضی حسین احمد صاحب نے ملی یک جہتی کونسل کا احیاء کر دیا ہے اور مختلف شعبوں کی کمیٹیاں بنا کر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اندریں حالات مناسب ہوگا کہ ماضی سے سبق سیکھا جائے اور کام کے اہداف کے تعین میں فراست و تدبر سے کام لیا جائے تا کہ منزل کھوٹی نہ ہو اور ٹھوس، سنجیدہ اور دیرپا کام کیا جاسکے۔ اس غرض سے ضروری ہے کہ آج کے حالات کا صحیح فہم ہمیں حاصل ہو اور درپیش چیلنجز کا ہمیں ادراک ہو تا کہ صحیح راہ عمل اختیار کی جاسکے۔

عصری حالات اور درپیش چیلنج

آج کل دینی تحریکوں اور کارکنوں کو فرقہ واریت کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سے چیلنجز کا بھی سامنا ہے۔ امریکی سرپرستی میں دہشت گردی کے نام پر اپنے ہی عوام کے خلاف جنگ لڑی جارہی ہے اور اس جنگ میں افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان اور یہاں کی دینی قوتیں امریکہ کا اہم ہدف ہیں اور موجودہ فرقہ واریت اور تشدد کی لہر کے پس منظر میں امریکی ہاتھ کام کر رہا ہے اور یہ بات بھی اب پوشیدہ نہیں رہی کہ ہماری صفوں سے انھیں بہت سے دینی لوگ استعمال ہونے کے لیے مل جاتے ہیں۔ اولیائے کرام کے مزارات پر دھماکے، شیعہ افراد کے قتل عام کے ساتھ ساتھ دیوبندی بریلوی مکاتب فکر میں بھی تصادم کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس وقت فرقہ واریت کے خاتمہ کے لیے کی جانے والی کوششوں کو بھی امریکی سرپرستی میں سبوتاژ کرنے کے لیے کچھ عناصر کام کر رہے ہیں۔ اس فرقہ وارانہ لہر کے ساتھ سب سے اہم ترین بات وہ عالمی ثقافتی یلغار ہے جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں لادینی اقدار تیزی کے ساتھ پھیلتی جارہی ہیں۔ گلوبلائزیشن کے نام پر ان تبدیلیوں کو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں اگر ذہنی اور فکری ارتداد کی لہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ حملہ ہر طرف سے ہے اور اس کی روک تھام کے لیے اجتماعی طور پر کوئی کوشش ہوتی نظر نہیں آرہی۔ ذرائع ابلاغ میں دن رات ہماری اخلاقی قدروں کی پامالی کی جاتی ہے۔ ادب کے میدان میں دینی اقدار کی تضحیک اور طنز و تشنیع ایک معمول بن گیا ہے۔ درسی کتابوں میں بھی کوشش کی جارہی ہے کہ ہمارے بچوں کو اپنی تاریخ، روایات اور اقدار سے مکمل طور پر کاٹ کر رکھ دیا جائے۔ اسلامی تاریخ اور علوم تاریخ ہمارے

سیکولر اور ماڈرن طبقے کا سب سے بڑا اور اہم ہدف ہیں۔ سرمایہ دارانہ معاشرے اور خالص مادی ونفسانی اقدار کے تحت مارکیٹ کلچر کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ علم کیا ہے اور علم کا قرآنی تصور اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ خود سے ایک الگ موضوع ہے، اور بدقسمتی سے اس کی حقیقت اور مفہوم کو بھی سرمایہ داری میں گم کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔ آج وہ علم سب سے معتبر اور قابل توجہ سمجھا جاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے کام آسکے۔ اگر علم آپ کے اکاؤنٹ بیلنس میں اضافہ نہیں کرسکتا ہے تو نہ وہ علم ہے اور نہ اس کے حصول کی جستجو کا کوئی مقصد اور فائدہ۔ یہ وہ گمراہی اور فتنہ پر مبنی نظریہ ہے جو اب ہمارے معاشرے میں نئی نسلوں کے ذہنوں میں انڈیلا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے زبان وادب کا سرمایہ بے فائدہ اور کباڑ خانہ ہے اور تاریخ کا مطالعہ ایک فرسودہ اور رجعت پسندانہ حرکت ہے۔

اسلامی اقدار کے بارے میں نوجوان نسل کے ذہنوں میں تشکیک کے کانٹے بوئے جا رہے ہیں۔ اسلامی سزاؤں کی تضحیک پر ہی بس نہیں کی گئی بلکہ ہر دینی قدر کو ہدف تنقید بنایا جا رہا ہے۔ آزادیٔ اظہار کے نام پر ہرا یرا غیرا اٹھ کر جو کچھ منہ میں آئے بک دے، اسے نشر کر دیا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں غیرت لابی کے نام سے ایک طنزیہ لفظ زیر بحث رہتا ہے۔ علماء کرام کو ٹاک شوز میں بلا کر تضحیک کے لیے الٹے سیدھے مباحث کروائے جاتے ہیں۔ مبشر لقمان ایک دفعہ ایک عالم دین سے پوچھ رہا تھا کہ قرآن سے ثبوت لاؤ کہ چار امام ہوں گے۔ سمجھانے والے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس طرح کی تفصیلات قرآن میں بیان نہیں کی گئیں بلکہ پیش آنے والے مسائل کا قرآن وسنت کی روشنی میں جو حل معتبر ائمہ کرام نے دیا ہے ان کی آرا کی روشنی میں یہ چار مکاتب فکر وجود میں آئے جو ائمہ کرام سے منسوب ہیں۔ جاہل اینکر پرسن کا اصرار تھا کہ نہیں آپ مجھے قرآن سے نکال کر دکھائیں کہ چار امام ہوں گے۔ اس صورت حال کو دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آج فرنگی دور کے موضوعات پھر سے زندہ ہو گئے ہیں اور پھر اسی طرح کے علم الکلام کی ضرورت ہے جو نیاز فتح پوری کے فکری پیروؤں کو منہ توڑ جواب دے اور نئی نسلوں کو فکری ارتداد سے بچائے۔ اسلام کے بارے میں ان کے ذہنوں میں جو مرعوبیت پائی جا رہی ہے اس مرعوبیت کے سائے ختم کیے جائیں، خرد کو اس فکری غلامی سے آزاد کرایا جائے اور قلب ونظر کو پاکیزگی عطا کی جائے۔

قرآن وسنت میں عصر حاضر کے حوالے سے جن فتنوں سے ہمیں آگاہ کیا گیا، ان پر غور بھی ضروری ہے اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ''عصر حاضر کی روشنی میں قرآن وسنت کی تعبیر کی جائے'' اس کی بجائے ہونا یہ چاہیے کہ عصر حاضر کو قرآن حکیم اور احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں پرکھا جائے۔ اس طرح عصر حاضر

کی تمام تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور دجالی تہذیب وتمدن کے سب فتنے عیاں ہو جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے قیامت کا تذکرہ فرماتے ہوئے اس طرف اشارے کیے ہیں جن کی مدد سے ہم اگر عصر حاضر کا جائزہ لیں تو کوئی ابہام نہیں رہتا۔ آپ ﷺ عصر حاضر کے فتنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دجال لوگوں کا ایمان سلب کرے گا۔ ایک آدمی صبح مسلمان ہوگا تو شام کو کافر ہو جائے گا، شام کو مسلمان ہوگا تو صبح کو کافر ہو جائے گا اور وہ دنیا کے مال وعزت کے بدلے اپنا دین بیچ دے گا (صحیح مسلم) اور سب سے بڑا فتنہ دنیا کے مال و دولت کو قرار دیا جو آج سرمایہ دارانہ نظام کی شکل میں ہمارے اوپر مسلط ہے۔ دجالی تہذیب وتمدن کا دجالی میڈیا اور سرمایہ دارانہ نظام آج مسلم معاشرے کو انہی فتنوں کی طرف دھکیل رہا ہے۔ ان حالات میں عالمی استعمار اپنے مقاصد کے لیے جس فرقہ وارانہ فساد کی بنیاد رکھنے کی کوشش کر رہا ہے، اتحاد امت کے داعی اداروں کو نہ صرف اس کے توڑ کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے بلکہ اس کے ساتھ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار کو وسعت دیں اور اہداف کا تعین نئے سرے سے کریں۔ معاشرتی تبدیلیوں اور امت کے اتحاد کے لیے اپنی جدوجہد کو اپنا اہم ترین ہدف بنا لیں۔ ہماری دینی تحریکوں کی جدوجہد کا بنیادی ہدف اس وقت نظام حکومت ہے جب کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی حکمت عملی وضع کی جائے کہ فرد کی اصلاح کے نتیجے میں معاشرے میں تبدیلی ظاہر ہو اور معاشرتی تبدیلی کا نتیجہ ریاستی تبدیلی کی صورت میں نکلے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسجد کو امت کا تہذیبی اور دعوتی مرکز بنایا جائے، قرآن کے سیکھنے سکھانے کے حلقے قائم ہوں۔ تزکیۂ نفس، تعلیم وتربیت اور علم وحکمت کے فروغ کے لیے لائبریریاں اور علمی مراکز بھی مسجد میں قائم ہوں۔

کرنے کے کام

اس بات کا ادراک کیا جانا ضروری ہے کہ صرف قوانین بنا دینے سے ہی اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ہاں قانون سازی پر ہر دور میں توجہ دی گئی ہے خواہ وہ اسلامی قوانین ہوں یا معاشرتی ضروریات کے لیے کی گئی ترامیم اور قوانین ہوں، ان سے ہٹ کر سماجی اصلاح کی کوئی اسکیم یا طریق کار وضع نہیں کیا گیا۔ ہم سب آگاہ ہیں کہ رشوت خوری کا خاتمہ صرف قانون بنا دینے سے ممکن نہیں۔ معاشرے میں اس کے خلاف نفرت موجود ہو یا پیدا کر دی جائے تو یقیناً اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ معاشرہ کی تمام قوتیں اگر اس بات کے لیے سرگرم ہوں کہ زیادہ سے زیادہ پیسہ جمع کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ سرمایہ کے حصول کو ہی معاشرے میں عزت اور مقام حاصل

ہو، دینی اداروں، مساجد اور تحریکوں میں بھی چندہ اور عطیات کی بنیاد پر لوگوں کو اکابرین کی قربت میسر آتی اور زیادہ اہمیت دی جاتی ہو تو وہاں یہ توقع کرنا کہ لوگ ایثار کے ساتھ سادہ زندگی بسر کریں گے، خام خیالی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ریاست کی تبدیلی ہی سے ہمہ گیر تبدیلی آئے گی لیکن ریاست کی تبدیلی سے پہلے فرد کی تبدیلی کے لیے جو کام ہو رہا ہے اس کو معاشرتی تبدیلی کا ذریعہ بننا چاہیے اور اگر قیادت دور اندیش ہو گی تو اس کے اثرات ریاستی نظام پر بھی یقیناً پڑیں گے۔

فرد کی تبدیلی کے لیے ہمارے ہاں کافی کام ہو رہا ہے۔ تمام دینی اصلاحی تحریکیں بالخصوص تبلیغی جماعت بہت ہی موثر انداز میں دین کے بنیادی مطالبات اور تعلیم کو عوام میں عام کر کے انفرادی زندگی کی اصلاح کے لیے قابل قدر کام کر رہی ہیں۔ دینی مدارس میں علم دین کے فروغ کے لیے عمدہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ دینی مدارس کے وفاق ہر سال تقریباً ۲۰ ہزار علماء اور فضلاء تیار کر کے معاشرے میں بھجواتے ہیں لیکن کیا یہ ارباب علم معاشرے میں اس طرح کے داعی اور قائد بنتے نظر آتے ہیں جو محلے اور گاؤں کی سطح پر مسجد کو معاشرے میں کلیدی کردار دلا سکیں، مغرب کی فکری اور دینی یلغار کا توڑ کر سکیں (جو ذرائع ابلاغ، نصابِ تعلیم اور جدید تعلیمی اداروں کے ذریعے پھیلائی جا رہی ہے) اور تقسیم ملت کی بجائے اتحاد ملت کے علم بردار بن جائیں۔ مساجد دعوت و تبلیغ، جہاد اور اقامت دین کا مرکز بن جائیں؟ سیرۃ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلسے بھی امام مسجد کی سرپرستی میں ہوں اور تبلیغی جماعت کے وفد کو بھی مسجد میں خوش آمدید کہا جاتا ہو اور کرپٹ سیاست دانوں اور دین کی تضحیک کرنے والے وڈیروں کے خلاف نفرت بھی مسجد سے شروع کی جائے۔ محلہ اور گاؤں میں فحاشی اور رشوت کے خاتمے کی تحریک اور مستحقین میں زکوۃ و صدقات کی تقسیم بھی مسجد کے ذریعے کی جائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ تمام علمائے کرام اور دینی طبقات میں اس بات کا احساس پیدا کیا جائے کہ وہ اپنی توجہ اور جدوجہد کا مرکز معاشرتی اصلاح کو بنا لیں اور یوں یہ پلیٹ فارم وسیع تر ہو جائے۔

اگر سارے دینی عناصر کا ایک موثر پلیٹ فارم بن جائے تو فرقہ واریت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ دین اسلام کے خلاف جو فکری اور تہذیبی جنگ ذرائع ابلاغ کے لاؤ لشکر کے ساتھ سیکولر فاشسٹوں نے شروع کر رکھی ہے اس کا استیصال بھی ہو سکتا ہے۔ علم و ادب کا میدان مکمل طور پر لادین طبقوں کے ہاتھ میں ہے۔ پرنٹ میڈیا میں سوائے چند گنے چنے افراد کے کوئی نہیں جو مسجد و مدرسہ کے حق میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے۔ فحاشی کا سیلاب ہمارے گھروں اور ہماری ماؤں کی گود تک پہنچ گیا ہے، اس کی روک تھام کے

لیے جدوجہد کی جانی چاہیے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ قاضی حسین احمد صاحب نے سپریم کورٹ میں ذرائع ابلاغ کے بارے میں سٹینڈ لیا ہے اور چیف جسٹس آف پاکستان نے بھی سماعت کے دوران اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہمارا ٹیلی ویژن اب اپنے افرادخانہ کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے کے قابل نہیں رہا۔

ہمیں چاہیے کہ اس جہاد کو فرقہ واریت کے خلاف جہاد اور سیکولر طبقات اور ملک دشمن طبقات کے خلاف جہاد میں تبدیل کر دیں۔ اس جہاد کو مسجد کی معاشرتی بالادستی اور تہذیبی مرکز بنانے کی جدوجہد کا رنگ دیں، مختلف مسالک کے درمیان مکالمہ کرائیں اور فرقہ واریت پھیلانے والوں کے خلاف کھل کر جدوجہد کریں یہاں تک کہ فرقہ پرست اور تقسیم کرنے والے عناصر خود ہی اپنے مکتب فکر اور ملت اسلامیہ سے کٹ کر رہ جائیں۔ اگر اس کے لیے فوری طور پر درج ذیل اقدامات کر لیے جائیں تو صحیح سمت میں ایک اہم پیش رفت ہوگی:

☆ مسالک کے درمیان مکالمہ/فروعی مسئلوں پر نفرت انگیز گفتگو کی حوصلہ شکنی کے ساتھ باہمی اتحاد و احترام کی فضا جو نیچے محلہ اور گاؤں تک سرایت کر جائے (مشترکہ جلسوں، محافل سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم و نعت، مجلس یاد حسین و صحابہ کرامؓ کا انعقاد) اور اس مقصد کے لیے بڑے پیمانے پر مساجد کے ائمہ کی تربیت اور راہ نمائی کے لیے ضلع یا تحصیل کی سطح پر تربیتی ورکشاپس کا انعقاد کیا جائے اور اجتماعی مسائل پر مکالمے اور گفتگو کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

☆ جدید تعلیم کے اداروں کے طلبہ اور اساتذہ کی تربیت کے لیے کسی قابل عمل نظام کی تشکیل اور سکول طلبا کے لیے گھروں میں لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ والدین کو متوجہ کیا جائے کہ وہ گھروں میں دینی کتب رکھیں۔ بجٹ کا بہت معمولی سا حصہ کتب کی خرید اور دینی اور تعمیری رسائل و جرائد کی خرید کے لیے وقف کریں۔

☆ نوجوانوں کو اسلامی تاریخ اور ادب کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کے لیے نسیم حجازی کے ناولوں، علامہ اقبال کی شاعری اور مثبت ادب کے فروغ کے لیے کام کیا جائے۔

☆ رشوت، سود، مال حرام اور کام چوری کے خلاف معاشرتی سطح پر مہم چلائی جائے۔

☆ دینی جماعتوں کے کارکنوں کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ معاشرتی تبدیلی کو اپنی زندگی کا مشن بنالیں اور محض سیاسی مصروفیت میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

وفیات　　پروفیسر شاہد رشید

مولانا سعید احمد رائے پوریؒ اور ان کا مشن

۲۶ ستمبر ۲۰۱۲ء کو مولانا سعید احمد رائے پوریؒ لاہور میں انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

حضرتؒ کا شمار ان معدودے چند بزرگوں میں کیا جا سکتا ہے جو صرف افراد ہی کے نہیں بلکہ پوری قوم اور ملت کے رمز شناس اور رہنما ہوتے ہیں۔ وہ ایک اولوالعزم انسان تھے اور ان کی زندگی اپنے نصب العین کے لیے بھرپور جدوجہد سے عبارت ہے۔ انہوں نے اپنے لیے عہدِ شباب میں جس راستے کا انتخاب کیا تھا، مرتے دم تک اسی پر قائم رہے۔ یہ ایک مشکل راستہ تھا لیکن جس کا دل اپنے نصب العین سے عشق کا سورج بن چکا ہو اس کے سامنے مشکلات کی برف کیسے ٹھہر سکتی ہے؟

شیخ الہندؒ، مولانا سندھیؒ اور حضرت مدنیؒ کے نام ہر وقت ان کی نوکِ زباں پر رہتے تھے اور یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے کالج اور یونیورسٹی کے نوجوانوں کو ایسے وقت میں ان حریت پسند علماء سے متعارف کرایا جب خود دینی مدارس اور جماعتوں میں ان بزرگوں کا تعارف بڑی حد تک ختم ہوتا جا رہا ہے اور اگر تعارف موجود بھی ہے تو محض مسلکی عقیدت کے طور پر۔ ان بزرگوں کی سوچ اور شخصیت کیا تھی اور ان کے اہداف اور منصوبے کیا تھے؟ یہ حضرت رائے پوریؒ کے حلقے میں شامل نوجوانوں کی تربیت کے لازمی عناصر تھے۔

ایک لفظ جو حضرتؒ بہت استعمال کرتے تھے، وہ 'فکر' اور 'شعور' کا لفظ ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی روّیے جس سطحیت اور زوال کا شکار ہیں، حضرتؒ کی شخصیت اور ان کی تحریک اس کا صحیح تریاق تھی۔ ان کی صحبت کا اثر یہ تھا کہ نوجوان بہت جلد جذباتیت، رومانویت اور سطحیت سے باہر آ جاتا تھا اور کُلی نقطۂ نظر (Holistic approach) سے حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا تھا۔ ان کی صحبت اور گفتگو ذہنی ترقی اور فکری ترفع کا باعث ہوتی تھی۔ ان کی گفتگو کا انداز بھی اتنا خوبصورت، غیر رسمی (Informal) اور اپنائیت لیے ہوتا تھا کہ ایک اجنبی شخص بھی یہ محسوس کرتا کہ میری ان سے برسوں کی

شناسائی ہے۔ خشک سے خشک موضوع ان کی شخصیت کی تر و تازگی سے کھل جاتا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور تھے اور لطیف حسِ مزاج کے حامل تھے۔ وہ اپنے اردگرد کے افراد سے بہت بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے علمائے کرام، مسند نشیں اور سیاسی لیڈر عام لوگوں اور اپنی ہی جماعت کے کارکنوں سے کتنا فاصلہ رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں حضرت رائے پوریؒ اپنی جماعت کے کارکنوں اور عام لوگوں کو وقت اور اہمیت دیتے تھے۔ ان کی باتیں توجہ سے سنتے اور ان کے سوالات کے جواب دیتے تھے۔

نوجوانوں کے سوالات کا سامنا کرنا بھی حضرتؒ کی ایک امتیازی صفت تھی، وہ نوجوانوں کو سوال کرنے سے روکتے نہیں تھے بلکہ سوال کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور پھر احسن طریقے سے بات سمجھاتے تھے۔ اس ماحول میں نوجوانوں کی ذہنی وفکری صلاحیتیں نکھرتی تھیں۔

حضرتؒ کا طرزِ زندگی نہایت سادہ تھا۔ وہ ساری عمر عوام کے ساتھ ریل گاڑیوں اور بسوں میں سفر کرتے رہے۔ آخری عمر میں بیماری کی وجہ سے ان کے لیے گاڑی خریدی گئی۔ عام کارکنوں کے ساتھ ان کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چلے جاتے۔ لباس بھی نہایت سادہ مگر صاف ستھرا پہنتے تھے۔

وہ جذباتی انسان ہرگز نہ تھے اور بڑے سے بڑے مجمع سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ وہ نہایت گہری بصیرت رکھتے تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی کو چند شاگرد یا مرید میسر آ جائیں تو وہ بڑے بڑے منصوبے بنانے لگتا ہے اور فوراً ایک جماعت رجسٹرڈ کرا کر پریس کانفرنس کر ڈالتا ہے۔ حضرتؒ اس طرح کے رومانوی ایڈونیچرز سے بہت دور تھے۔ وہ نہایت ٹھنڈے دل اور حقیقت پسندی کی نگاہ سے صورتِ حال کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور حالات سے باخبر رہتے تھے۔

حضرت رائے پوریؒ نے ایک خانقاہ کا روایتی پیر بننے کی بجائے ایک بڑے نصب العین کو اپنے سامنے رکھا۔ ان کی پوری زندگی اسی منصب العین کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ یہ نصب العین کیا تھا؟ وہ نوجوانوں میں دین کی جامعیت کا نظریہ منتقل کرنا چاہتے تھے، وہ انہیں ان اکابر علماء سے متعارف کرانا چاہتے تھے جنہوں نے آزادی وحریت کی خاطر کالا پانی، جلاوطنی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ وہ چاہتے تھے کہ نوجوان سیاسی بصیرت اور گہرے شعور کے حامل ہوں اور کوئی بھی بیرونی قوت ان کے مذہبی جذبات کو استعمال کر کے ان کا نفسیاتی استحصال نہ کر سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ نوجوان دین کے مقاصد اور دین کے مجموعی مزاج کا فہم حاصل کریں اور دورِ حاضر کے تقاضوں سے

بھی باخبر ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ نوجوان حقیقت پسندی اور معروضیت کی بنیاد پر حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرلیں اور وہ چاہتے تھے کہ باشعور نوجوانوں کا یہ اجتماع منظم ہو اور معاشرے میں تبدیلی کی بنیاد فراہم کرے۔

زوال اور گراوٹ کے زمانے میں ان مقاصد کا حصول آسان کام نہیں تھا اور نہیں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے خود اپنے ہی ہم مشرب لوگوں نے انگلیاں اٹھانی شروع کردیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ بہت عرصے سے ہمارا مذہبی طبقہ درست تجزیے اور دیانت دارانہ تحقیق کی صلاحیتیں کھو بیٹھا ہے۔ وہ جب بھی روایتی سانچے سے مختلف کوئی بات دیکھتا ہے تو اس کا انکار کردیتا ہے۔ وہ محض ایک ہی زبان میں بات کرنے کا خوگر ہو چکا ہے اور وہ فتوے کی زبان ہے۔ بعض اوقات کسی کو فتوے کا نشانہ بنانے کے لیے استفتاء خود تیار کرایا جاتا ہے۔ بعض اوقات محض شک وشبے اور غلط فہمی کی بنیاد پر فتویٰ داغ دیا جاتا ہے اور سب سے المناک بات یہ ہے کہ بسا اقاوت مخصوص تعصّبات، شخصیت کا ٹکراؤ (personality clash) اور انا پسندی کے روّیے بھی کسی کے خلاف فتویٰ صادر کرنے کا محرک بن جاتے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک صورتِ حال ہے۔ علم وعمل کی دنیا میں اختلافِ رائے نہ صرف فطری ہے بلکہ انسانی ترقی کے لیے ناگزیر بھی ہے لیکن کیا اختلافِ رائے کا یہی طریقہ ہے کہ آپ کسی کو یک قلم مسترد کردیں اور اس کی شخصیت کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کردیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے اختلافِ رائے کا سلیقہ ابھی نہیں سیکھا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری توانائیوں اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ ایک دوسرے کے خلاف اس طرح کی سرگرمیوں میں گزر جاتا ہے جس سے دین اور انسانیت کے اصل دشمنوں کو ہنسنے اور مضبوط ہونے کا موقع ملتا ہے۔

یقیناً اس سے یہ مراد نہیں کہ حضرت رائے پوریؒ اور ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ اختلاف ضرور کیا جائے لیکن اس کی بنیاد سنجیدگی اور دیانت پر ہو۔ اکابر علماء نے ایک دوسرے کے نظریات سے اختلاف کیا اور بڑے سے بڑا مفسر، محدث اور فقیہ بھی اپنے معاصر علماء میں 'مقدس' اور تنقید سے بالاتر نہیں بن سکا۔ یہی اسلام کی علمی وفکری تاریخ کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے۔

اس وقت معاصر مذہبی دنیا مختلف حلقوں، دائروں اور جزیروں میں منقسم ہے۔ ہر حلقہ اپنے آپ کو اکمل اور افضل تصور کرتا ہے اور دوسروں کو کمتر سمجھنا اپنے ایمان کا حصہ گردانتا ہے۔ کم از کم درجے میں وہ یہ ضرور سمجھتا ہے کہ 'یہ بے چارے ابھی پوری بات نہیں سمجھ سکے۔' یہ صورتِ حال ایک حد تک فطری بھی ہے اور اس سے امتِ مسلمہ کے لیے مثبت نتائج بھی برآمد ہوسکتے ہیں لیکن یہ تب ممکن

ہے جب ان مختلف جزیروں کے مابین پُل موجود ہوں، جب ہم اپنے اپنے دائرے کے گرد اونچی فصیلوں اور دیواروں میں کچھ کھڑکیاں اور روشن دان بھی رکھ لیں، جب ہم دوسروں کے تناظر (perspective) کو سمجھنے کی دیانت دارانہ کوشش کرتے رہیں، جب ہم دوسرے حلقوں سے بالکل کٹ کر نہ رہ جائیں بلکہ محبت اور آدمیت کے جذبے سے سماجی روابط کو فروغ دیں اور دوسرے لوگوں کے لیے حسنِ ظن رکھتے رہیں جب کہ اپنی نیت پر شک کرتے رہیں۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب نظریاتی تعصب بغض، عناد اور کمینگی بن جائے تو اعلیٰ وارفع نظریات بھی صحت مند تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔

ہم یہ بات جاننے کے لیے علمائے عمرانیات اور ماہرینِ نفسیات کے رہینِ منت نہیں ہیں کہ انسان ذہنی وجذباتی لحاظ سے ایک پیچیدہ مخلوق ہے۔ ہم اس بات کا براہِ راست تجربہ رکھتے ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ انسان محض فکر (Intellect) یا عقل (Reason) کا نام نہیں ہے بلکہ وہ جذبات اور ارادوں کی بھی ایک مخفی دنیا رکھتا ہے۔ انسان کے جذبات اور ارادوں کی یہ Non-rational دنیا اس کی rational دنیا پر اکثر غالب رہتی ہے اگرچہ ہم عام طور پر اپنی گفتگو اور برتاؤ میں ایسا ظاہر نہیں کرتے۔ انسانی فطرت کا یہ علم کسی بھی نظامِ تربیت کو درست خطوط پر استوار کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یعنی ایسا ممکن ہے کہ آپ کچھ نظریات کو سمجھ لیں، انہیں منطقی طور پر ٹھیک ٹھیک بیان کرنا سیکھ لیں اور دوسرے نظریات کو رد کر کے اپنے نظریات کی عقلی برتری ثابت کر سکیں لیکن یہ نظریات آپ کے کردار میں ڈھل جائیں اور آپ کی شخصیت کے اوصاف بن جائیں، یہ دوسری بات ہے۔ جمہوریت کو ایک نظریے یا نظام کے طور پر سمجھنا اور سمجھانا آسان ہے لیکن جمہوری روّیوں کو اپنانا ایک مشکل کام ہے۔ یہ وہ چیلنج ہے جو آج ہماری تمام دینی جماعتوں اور حلقوں کو درپیش ہے۔ حضرت رائے پوریؒ کا حلقہ اس چیلنج کا کیسے سامنا کرتا ہے، آنے والا وقت ہی اس کا صحیح فیصلہ کر سکتا ہے۔ حضرت رائے پوریؒ کے جانشین علماء اور احباب سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ حضرتؒ کے مشن کا صحیح وارث بنتے ہوئے جہاں اکابر کے نظریات پر نوجوانوں کو منظم کریں گے وہیں وسعتِ قلبی اور انسان دوستی کو اپنے کردار کا بنیادی جوہر بنالیں گے اور مذہبی دنیا میں ایک نئے گروہ کا اضافہ کرنے کی بجائے ملک وقوم کو ایک ایسی قیادت عطا کریں گے جو ایک طرف علماء حق کے تاریخی تسلسل سے منسلک ہو اور دوسری طرف قوم کو زوال سے نکالنے کی صلاحیتوں اور صفات سے متصف ہو۔

مسئلہ ناموس رسالت ﷺ: جذباتیت اور بے حمیتی کے درمیان مسلکِ اعتدال کی تلاش

چھٹی دو روزہ **مجلس فکر و تدبر** ۲۴، ۲۵ نومبر ۲۰۱۲ء

بلال اسلامک سنٹر، جھوک نواز (ضلع وہاڑی) پنجاب

فون نمبرز: 0300-759997 0323-7943231, 0302-6997231

تبصرۂ کتب		ڈاکٹر محمد امین

سیکولرزم ۔ مباحث اور مغالطے

از طارق جان

بڑے عرصہ بعد ایک عمدہ کتاب پڑھنے کو ملی۔

بحیثیت ایک طالب علم ہماری رائے یہ ہے کہ ہر عہد کا ایک فتنہ اور چیلنج ہوتا ہے اور مسلم معاشرے کے لیے آج کے عہد کا فتنہ اور چیلنج مغربی فکر و تہذیب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر تہذیب کی طرح مسلم تہذیب کے زوال کا بنیادی سبب بھی داخلی ہے یعنی افراد قوم کی اپنے نظریۂ حیات سے عدم وابستگی لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مغربی فکر و تہذیب مسلم زوال کا سب سے بڑا خارجی سبب اور محرک ہے۔ اس نے زوال پذیر مسلم معاشرے کی گرتی دیوار کو دھکا دے کر گرا دیا اور اب ہزار چالوں سے اس کی تعمیر نو میں رکاوٹ ڈال رہی ہے تاکہ مسلم امہ زوال کے گڑھے سے نہ نکل سکے۔ ہماری نالائقی اور بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں مطالعۂ مغرب کی روایت بہت کمزور ہے چنانچہ مغربی فکر و تہذیب کا تنقیدی مطالعہ ہمارے دینی مدارس اور سکولوں میں تو کجا ہماری جامعات کے پوسٹ گریجوایٹ پروگراموں میں بھی کہیں نہیں ہوتا اور عالم اسلام کی کسی جامعہ میں مرکز مطالعۂ غرب (Occidental Study Centre) بھی موجود نہیں ہے جب کہ اہل مغرب کے ہاں مطالعۂ شرق و اسلام (Orientalism) کا ایک عظیم الشان ادارہ موجود ہے حالانکہ وہ ایک غالب تہذیب تھی اور اسے مطالعۂ شرق و اسلام کی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی ہمیں مطالعہ غرب کی ہے تاکہ ہم مغرب اور اس کی فکر، حکمت عملی اور اسلام اور مسلم دشمن چالوں اور سازشوں کو سمجھ سکیں۔ اسی کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اردو میں اسلامی تناظر میں مغربی فکر و تہذیب کے تنقیدی مطالعے پر بہت کم مطالعاتی مواد ملتا ہے۔ ہم خود بھی کئی سالوں سے اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن زندگی ایسے گزر رہی ہے کہ ؎ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ان حالات میں ڈاکٹر طارق جان صاحب کی یہ کتاب ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح ہے جس نے مشام جان کو معطر کر دیا ہے اللھم زد فزد۔

ڈاکٹر طارق جان صاحب (سنجیدہ اہلِ علم کی طرح انہوں نے 'ڈاکٹر' کا سابقہ اپنے نام کا جز و نہیں بنایا) کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مغربی ماخذ کا خوب مطالعہ کیا ہے اور انہیں اس مواد کو اسلامی تناظر میں استعمال کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی سمت درست ہے اور اسلام اور نظریۂ پاکستان پر ان کا یقین اتنا ہی پختہ ہے جتنا مغربی فکر (سیکولرزم) کی گمراہی اور لادینیت پر اور ان کی نظر اتنی گہری ہے کہ سیکولرزم کا سرطان جس جس صورت میں بھی ہمارے جسم ایمانی پر حملہ آور ہوتا ہے وہ اسے خوب پہچانتے ہیں اور اس کی نشان دہی کر کے اس کا توڑ بتاتے ہیں۔

ان کا طریق فکر یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے مختلف فکری دھاروں کو 'سیکولرزم' میں مجتمع سمجھتے ہیں اور ان سب کو سیکولرزم کے تحت ہی بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح کراچی کے ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب اور خالد جامعی صاحب کا مغرب مخالف مکتبۂ فکر مغربی فکر کے مختلف دھاروں کو 'نظام سرمایہ داری' میں مرتکز سمجھتا ہے اور اس کی ساری گمراہیوں کو اسی عنوان کے تحت بیان کرتا ہے۔ اس اسلوب میں اگرچہ ایک نوع کا فکری تجاوز موجود ہے لیکن طرزِ بیان کے حوالے سے یہ قابل برداشت اور قابل قبول ہونا چاہیے کیونکہ زبان و ادب میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جز و کا اطلاق کُل پر کر دیا جاتا ہے خصوصاً اس صورت میں کہ وہ جز و کل کا اہم حصہ ہو مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑا وجیہ ہے۔ اب صاحبانِ علم جانتے ہیں کہ وجیہ عربی لفظ ہے اور وجہ عربی میں چہرے کو کہتے ہیں گویا وجیہ کا مطلب ہوا اچھے چہرے والا یا خوبصورت چہرے والا گویا ہم نے جز و کا انطباق کُل پر کر دیا اور وجیہ ہم ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کا صرف چہرہ ہی خوبصورت نہیں ہوتا بلکہ اس فرد کا سارا سراپا خوبصورت ہوتا ہے۔ بہرطور یہ ایک طرز بیان ہے ورنہ جہاں تک مغربی تہذیب کی فکری اساسات کا تعلق ہے وہ نہ خالی سیکولرزم ہے اور نہ صرف سرمایہ دارانہ نظام ہے بلکہ یہ دونوں ان اساسات کا ایک جز و ہیں۔ مغربی تہذیب کی فکری اساسات گنواتے ہوئے، ہم ذاتی طور پر، چار نظریات کا ذکر کیا کرتے ہیں یعنی ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور سائنٹسزم ،اور ہیومنزم کو بنیادی فکر سمجھتے ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہ کوئی فکری اختلاف نہیں بلکہ طرز بیان اور اسلوب کی بات ہے۔

بہت سے نامور لوگوں نے اس کتاب پر تقاریظ اور تبصرے لکھے ہیں جن میں اوریا مقبول جان، ڈاکٹر صفدر محمود، ہارون رشید، ڈاکٹر سفیر اختر، سجاد میر، ڈاکٹر محمد حامد، سلیم منصور خالد اور مستنصر حسین تارڑ شامل ہیں۔

آخر میں کتاب کے اگلے ایڈیشن کو مزید بہتر بنانے کے لیے مصنف اور ناشر کے غور کے لیے چند

تجاویز: کتاب کے مندرجات (فہرست مضامین) سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب پچیس تیس مضامین یا مباحث پر مشتمل ہے لیکن جب کتاب پڑھی تو پتہ چلا کہ کتاب عرضِ ناشر، تمہید (یا مقدمہ) اور ۲۶ ابواب پر مشتمل ہے۔ ممکن ہے ہماری طرح دوسرے قارئین بھی کتاب پڑھنے سے پہلے فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالتے ہوں تاکہ ایک نظر میں پتہ چل جائے کہ کتاب کے اندر کیا ہے؟ اس لیے ہماری دانست میں قاری کا امتحان لینے کی بجائے اسے سیدھے سبھاؤ یہ باتیں بتا دی جائیں تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ اسی طرح کتاب کے مضامین کو آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے چار مضامین (صفحہ ۱۹ تا ۱۳۴) 'اسلام اور سیکولرزم' سے متعلق ہیں جب کہ باقی ابواب کا موضوع 'پاکستان اور سیکولرزم' ہے۔ ہماری رائے میں کتاب اور فہرست مضامین کی اس طرح حصوں، ابواب اور فصول میں تقسیم کتاب کے فہم میں معاون ہوتی ہے لہٰذا اسے اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔

۶۶۰ صفحات کی یہ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر خوبصورت چھپی ہے لیکن ناشر نے (غالباً قیمت کم رکھنے کے لیے) اسے پیپر بیک میں شائع کیا ہے جس کا نقصان یہ ہے کہ کتاب مطالعے کے دوران ہی اکھڑ گئی، اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا اور ہمیں اسے جلد ساز کے پاس بھجوانا پڑا۔ اس لیے ہماری رائے میں اسے ہارڈ باؤنڈ ہی ہونا چاہیے تھا، خواہ قیمت کچھ بڑھ ہی جاتی۔ اسی طرح ہر اچھی کتاب میں پڑھتے ہوئے نشانی رکھنے کے لیے فیتہ ضرور ہونا چاہیے کیونکہ اتنی ضخیم کتاب ظاہر ہے کہ ایک دو نشستوں میں نہیں پڑھی جاسکتی اور نشانی لگانے کے لیے کاغذ کا کونا دوہرا کرنے کا پرانا طریقہ ہمارے ذوق پر تو گراں گزرتا ہے۔

کتاب کے پروف پڑھنے پر محنت کی گئی ہے لیکن پھر بھی کسر باقی ہے لہٰذا کمپوزنگ اور املاء کی غلطیاں اگر اگلے ایڈیشن میں مزید کم ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔ کم از کم، مندرجات کے فوراً بعد والا صفحہ 'سیسئ بے خبرے تیرا لٹیا شہر بھنبھور نی'۔ ترجمہ بہت عمدہ ہے جس کے لیے مترجم مستحق مبارک باد ہیں تاہم بعض الفاظ اور تراکیب نامانوس اور محتاج نظرِ ثانی محسوس ہوتی ہیں۔ اگر کتاب کسی ماہر زبان و املاء کی نظر سے ایک دفعہ گزر جائے تو بہت عمدہ ہو۔ کتاب اپنی پیشکش میں عام کتابوں سے بہتر ہے لیکن خوب سے خوب تر کی جستجو تو جاری رہنی چاہیے، خصوصاً اس وقت جب مصنف صاحبِ ذوق بھی ہو اور ناشر اس کے نخرے برداشت کرنے کے لیے تیار بھی۔

کتنا ہی اچھا ہو اگر پاکستان کی ساری یونیورسٹیوں کی لائبریریاں اس کتاب کو خریدیں اور اسلامی علوم، پاکستانیات، سیاسیات اور سماجی علوم کے اساتذہ و منتہی طلبہ اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب اسلام آباد میں سعید بکس جناح سپر مارکیٹ، لاہور میں کتاب سرائے اردو بازار اور کراچی میں فضلی بک سٹور اردو

بازار سے ۸۸۰ روپے میں دستیاب ہے۔

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو

۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل
۲۔ ہمارا دینی نظامِ تعلیم
۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال واخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن وحدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز

۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
۱۹۔ حقیقتِ تصوف

انگریزی

۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols)

۲۱۔ Noble Quran, Part 1

۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan

عربی ۲۳۔ السلطةالتشريعية۔دراسةمقارنة